قرآنی نظام ربوبیّت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ ـــــ لاہور

قیمت فی پرچہ	ٹیلیفون :- ۸۸۰۸۰۰	بدل اشتراک
۴ چار روپے	خط وکتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور	سالانہ پاکستان /۴۸ روپے غیر ممالک /۹۸ روپے
شمارہ ۳	مارچ ۱۹۸۶ء	جلد ۳۹

فہرست

۱۔ لمعات ـــ "مجوّزہ شریعت بل" ـــ ۲

۲۔ حقائق و عبر : (۱) علمائے حق ایک میز پر (۲) جمعیتِ علمائے اسلام اور پاکستان۔ ـــ ۸
(۳) قرآنِ مجید کے بلند مرتبہ مفسّر (۴) پیری مریدی کا چکّر (۵) اخوان المسلمین
اور اسرائیل (۶) اہلحدیث علماء کا مبلغِ علم (۷) جماعتِ اسلامی کی پریس سنسر شپ (۸) ۸½ سالہ
دورِ نفاذِ اسلام (۹) عالمی مساجد کونسل کے فیصلے (۱۰) زمانۂ جدید کا سب سے بڑا عالمِ دین۔

۳۔ جماعتِ اسلامی اور عائلی قوانین ـــ (محمد شاہد عادل) ـــ ۱۷

۴۔ عائلی قوانین ـــ (قرآن کریم کی روشنی میں) ـــ ۲۲

۵۔ افکارِ پرویزؒ کی صدی ـــ (محمد اسلام صاحب) ـــ ۳۳

۶۔ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ (ثریا عندلیب صاحبہ) ـــ ۴۳

۷۔ غلام احمد پرویزؒ صاحب (حافظ محمد یعقوب خان، تاجک صاحب) ـــ ۴۷

۸۔ حسینِ کردار کا نقشِ تابندہ (قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ) ـ مسلسل ـ (محترم پرویزؒ صاحب) ۴۹

[illegible] شیخ عبدالحمید، مقامِ اشاعت : ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور، مطبوعہ : اشرف پرنٹنگ پریس ۹-ایبک روڈ لاہور

لمعات

"مجوزہ شریعت بل"

کچھ عرصہ پہلے، سینٹ کے ایوان میں مجلسِ شوریٰ کے شریعت گروپ کی جانب سے شریعت بل مجریہ ۱۹۸۵ء پیش کیا گیا تھا۔ ایوان کے ضوابط کے مطابق یہ بل ایوان کی قائم کردہ ایک منتخبہ کمیٹی کی رائے حاصل کرنے کے لئے اس کے سپرد کر دیا گیا۔ اس کمیٹی نے بل کے بارے میں اپنی رپورٹ ۲ دسمبر ۱۹۸۵ء کو ایوان میں پیش کر دی، اس رپورٹ پر غور کرنے کے بعد، سینٹ نے اپنے ۲۶ جنوری ۱۹۸۶ء کے اجلاس میں یہ فیصلہ کیا کہ رائے عامہ حاصل کرنے کے لئے اس بل کو مشتہر کر دیا جائے۔

یہ بل، جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، مجلسِ شوریٰ میں قائم شریعت گروپ کی جانب سے ایوان میں پیش کیا گیا تھا۔ اب جب کہ اس بارے میں عوام کی رائے معلوم کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے تو اس گروپ سے تعلق رکھنے والے علماء ملک کے طول و عرض کا دورہ کر رہے ہیں، تاکہ اس بل کی حمایت میں عوامی تائید حاصل کی جا سکے۔ اس گروپ کے ایک لیڈر اکوڑہ خٹک کے مولانا عبدالحق صاحب نے مورخہ ۲ فروری ۱۹۸۶ء کو مرکزِ حزام الدین بشیر انوالہ گیٹ لاہور میں علماء کے ایک گروہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اس بل کے ذریعے وہ ملک میں قرآن و سنت کی بالادستی چاہتے ہیں۔ آیئے ہم دیکھتے ہیں کہ یہ حضرات قرآن و سنت کی کس قسم کی برتری چاہتے ہیں۔

مجوزہ شریعت بل میں، شریعتِ اسلامی کا اصل ماخذ قرآنِ مجید اور سنتِ رسولؐ کو تسلیم کیا گیا ہے۔ علامہ پرویز صاحب فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے مولوی حضرات، نام تو قرآنِ مجید اور سنتِ رسولؐ کا لیتے ہیں، لیکن اس سے ان کی مراد قرآن مجید کی تعلیمات نہیں ہوتیں، اس کے پردے میں وہ امتِ مسلمہ پر فقہاء کے ایسے فتاوے ٹھونسنے کی کوشش کرتے ہیں، جن کا قرآن مجید کی تعلیمات سے دُور کا تعلق بھی نہیں ہوتا۔ ——— علامہ صاحب نے تو اپنی ساری عمر قرآنِ مجید کی تعلیمات عام کرنے میں صرف کر دی اور علماء

سے بھی یہ مطالبہ کیا کہ جب وہ قرآنِ مجید کا نام لیتے ہیں، تو عمل بھی اسی کی تعلیمات پر کریں، لیکن علماء کی جانب سے اس کا جواب کفر کے فتووں کی صورت میں دیا گیا۔

علامہ پرویزؒ صاحب سے پہلے حضرت شاہ ولی اللہؒ بھی مسلمانانِ ہند کو اسی طرف بلاتے رہے اور اس مقصد کے لئے انہوں نے پہلی مرتبہ قرآنِ مجید کا فارسی میں ترجمہ کیا تاکہ عوام اسے سمجھ سکیں، خیال رہے کہ اُس وقت عوام کی علمی زبان فارسی تھی۔ اُن کے اس طرزِ عمل سے چونکہ طبقۂ علماء کے مفادات پر ضرب پڑتی تھی، اس لئے انہوں نے آپ کے ترجمے کی کوشش کی سخت مخالفت کی یہاں تک کہ عوام کو آپ کے خیالات سے دُور کرنے کے لئے آپ پر کفر کا فتویٰ لگا دیا۔ یہی سلوک اِن حضرات نے علامہ پرویز مرحوم کے ساتھ بھی کیا۔

کچھ عرصہ پہلے تک ہمارے ہاں نام تو کتاب وسنّت کا لیا جاتا تھا لیکن عملاً اس سے مراد حنفی فقہ ہوتی تھی اگرچہ حنفی فقہ کو ماننے والوں کی ہمارے ملک میں اکثریت ہے لیکن فقہ جعفریہ کے پیروکاروں اور اہلِ حدیث فرقہ سے تعلق رکھنے والے عوام کی تعداد بھی اتنی کم نہیں کہ ملک میں اسلامی قانون کی تدوین کے سلسلے میں انہیں کوئی وزن ہی نہ دیا جائے، بلکہ پچھلے چند سالوں سے انہوں نے یہ تحریک شروع کر رکھی ہے کہ وہ کسی صورت میں حنفی فقہ کو اپنے اوپر مسلّط نہیں ہونے دیں گے۔

اس صورتِ حالات سے نمٹنے کے لئے مجوزہ بل میں جو نیا طریقِ کار اختیار کیا گیا ہے، وہ اگرچہ علماء کے پہلے طرزِ عمل سے قدرے مختلف ہے، لیکن عملی طور پر اس طریقے سے ایسی نئی پیچیدگیوں کے پیدا ہونے کا امکان ہے کہ جس کے نتیجے میں اسلامی قانون کی تدوین ممکن ہی نہ رہے گی۔ مثلاً بل کی دفعہ ۱۲ کے ذیل میں فرمایا گیا ہے کہ اس ملک میں قرآن وسنّت کی وہی تعبیر معتبر سمجھی جائے گی جو اہلِ بیت عظام، صحابۂ کرام اور امّتِ مسلمہ کے مجتہدین اور شریعتِ اسلامی کے مسلّمہ قواعد کے مطابق ہوگی۔

اس عبارت کے ذریعے فقہ حنفی کے پیروکاروں، فقہ جعفریہ کے ماننے والوں اور فرقۂ اہلحدیث کے علماء کو راضی کرنے کی کوشش کی گئی ہے، لیکن عملاً ان تینوں فرقوں کی قرآن و سنّت کی تعبیر ایک دوسرے سے اتنی زیادہ مختلف ہے کہ اس کے نتیجے میں کوئی متفقہ قانون نہیں بنایا جا سکتا۔ اس کی وضاحت ایک مثال سے ہوگی اور یہ مثال ہے، ایک ہی مجلس میں تین طلاقیں دے کر عورت کو جدا کر دینا۔ یہ مثال ہم اس لئے بیان کر رہے ہیں کہ امّتِ مسلمہ کے جمہور علماء کے نزدیک طلاق کا یہ طریقہ اسلام میں ایک بدعت ہے، لیکن حنفی علماء کے نزدیک یہ طلاق دینے کا اسلامی طریقہ ہے۔ چنانچہ جب عائلی قوانین مجریہ ۱۹۶۱ء میں طلاق کے اس طریقے پر پابندی لگا دی گئی ہے اور اس کی بجائے طلاق وسنّت کو رائج کر دیا گیا تو جماعتِ اسلامی سمیت تمام علماء نے اس کے خلاف شور

مچا دیا اور اس بارے میں انہوں نے یہ اعلان کیا:۔

بلاشبہ یہ چیز بعض فقہی مذاہب کے نزدیک درست ہے، لیکن حنفی مذہب کے خلاف ہے، حنفی مذہب میں اگر تین طلاق بیک وقت دیئے گئے ہوں، تو اس سے طلاق مغلّظ واقع ہو جاتی ہے، اور مطلقہ عورت سے، اُس کا سابق شوہر نہ تو مدتِ عدّت کے اندر رجوع کر سکتا ہے اور نہ عدّت گزر جانے کے بعد، اس کے ساتھ پھر نکاح کر سکتا ہے، جب تک کہ اس کی تحلیل نہ ہو جائے۔ اس ملک کے باشندوں کی عظیم اکثریت حنفی ہے، ان حنفی باشندوں کو جو اعتماد امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ اور مذہب حنفی کے ائمہ و فقہا کے علم و تقویٰ پر ہے وہ اعتماد آج کل کے قانون سازوں پر نہیں ہے"۔

"عائلی قوانین پر علماء کے اعتراضات صفحات ۱۸، ۱۹ مطبوعہ پبلک آرٹ پریس پشاور)

ائمہ اہلِ بیت کے نزدیک ایک ہی مجلس میں تین طلاق دینا ایک لغو و فعل ہے اور اہلحدیث علماء کے نزدیک یہ فعل قرآن و سنّت کے ساتھ مذاق کرنے کے مترادف ہے۔

اب قرآن و سنّت کی تعبیر کے بارے میں شریعت بل میں جو تجویز پیش کی گئی ہے، اس کے مطابق ان تینوں طبقات یعنی حنفی فقہاء، ائمہ اہلِ بیت اور اہلِ حدیث علماء کی تعبیروں کو معتبر سمجھا جائے گا۔ جب کہ یہ تینوں تعبیریں ایک دوسرے کے متضاد ہی نہیں بلکہ الٹ ہیں، تو ان متضاد تعبیروں سے کسطرح متفقہ قانون بنایا جا سکے گا!۔

اس بل کی دفعہ سات کے ذیل میں فرمایا گیا ہے کہ حکومت کے تمام اعمال بشمولِ صدرِ مملکت اسلامی قانونِ عدل کے مطابق عدالتی احتساب سے بالاتر نہیں ہوں گے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شریعت بل کو پیش کرنے والے علماء نے اس بارے میں حنفی فقہا کے فتاوٰی کا مطالعہ نہیں کیا، برصغیر میں صدیوں تک جو اسلامی نظامِ عدل قائم رہا ہے، وہ حنفی فقہ کے اصولوں پر قائم رہا ہے اور حنفی فقہ میں سربراہِ حکومت کو ہر قسم کے احتساب سے بالاتر سمجھا جاتا رہا ہے۔ اس بارے میں ان کا فتویٰ یہ ہے:۔

وَكُلُّ شَيْءٍ صَنَعَهُ الْإِمَامُ الَّذِي لَيْسَ فَوْقَهُ إِمَامٌ فَلَا حَدَّ عَلَيْهِ إِلَّا الْقِصَاصَ فَإِنَّهُ يُؤْخَذُ بِهِ

(ہدایہ مع شرح فتح القدیر جلد چہارم ص ۱۶۰)

ترجمہ:۔ اسلامی حکومت کا سربراہ جو کسی دوسرے مسلمان حکمران کے ماتحت نہیں، اگر کوئی جرم کرے تو اس پر کوئی شرعی حد نافذ نہ ہو گی، سوائے قصاص کے۔ (یعنی اگر اس پر قتلِ ناحق ثابت ہو جائے تو اس سے قصاص دلوایا جائیگا)۔

بل کی دفعہ ۱۱ میں ججوں کی تربیت کے سلسلے میں فرمایا گیا ہے کہ علومِ شرعیہ اور اسلامی قانون کی تعلیم اور ججوں کی تربیت کا ایسا مؤثر انتظام کیا جائے کہ مستقبل میں علومِ

شرعیہ اور خصوصاً اسلامی قانون کے ماہر تیار ہو سکیں۔

علماء کی جانب سے اس قسم کا مطالبہ پہلے بھی کیا جاتا رہا ہے اور ان کے مطالبے کے جواب میں کچھ عرصہ پہلے جج حضرات اور قانون کے پیشے سے تعلق رکھنے والے دوسرے لوگوں کے لئے تین تین چار چار ماہ کے قاضی کورسوں کا انتظام کیا گیا۔ ان لوگوں کو اس مدت کے دوران اردو کی چند کتب کی مدد سے اسلامی قانون کی تعلیم دی گئی۔ علماء حضرات نے اس اقدام کو سراہا بلکہ مختلف دینی مدارس نے اسی نمونے پر اپنے ہاں ایسے ہی قاضی کورسوں کا انتظام کیا اور تین چار ماہ کے اندر بہت سے قانون دانوں کو اسلامی قانون کا ماہر بنا دیا۔

اسلامی قانون، جو فقہ کا دوسرا نام ہے، ایک وسیع علم ہے۔ جس کے مناسب مطالعہ کے لئے کئی برس کی محنت درکار ہے۔ لیکن اس مطالعہ کی اوّلین شرط عربی زبان کا علم ہے۔ طلوعِ اسلام کے قارئین کو یاد ہوگا کہ اس سلسلے میں جب علماء کی جانب سے پہلی بار مطالبہ کیا گیا تو طلوعِ اسلام نے اپنے شمارے بابت جنوری ۱۹۶۸ء میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ لاء کالج میں داخلے کے لئے، عربی زبان کا مضمون لازمی قرار دیا جائے۔ اور پھر وقتاً فوقتاً اس کی جانب سے اس مطالبے کو دہرایا جاتا رہا ہے، لیکن چونکہ یہ آواز طلوعِ اسلام کی جانب سے اٹھائی گئی تھی، اس لئے علماء کے طبقے میں سے کسی نے اس کی تائید نہ کی اور اب صورت یہ ہے کہ بیس سال گذر جانے کے بعد بھی ہم ابھی تک وہیں کھڑے ہیں۔ یہ بات ظاہر ہے کہ جب قانون کی تعلیم حاصل کرنے والے عربی زبان سے نابلد ہوں گے، تو وہ اسلامی قانون میں مہارت کسطرح حاصل کر سکیں گے، چنانچہ ہمارا اب بھی نقطۂ نظر یہ ہے کہ اس مقصد کے لئے قانون کے طالب علموں کے لئے عربی زبان کا علم لازمی ہونا چاہیئے۔ اس کے بغیر وہ کبھی بھی اسلامی قانون میں مہارت حاصل نہیں کر سکیں گے۔

قرآن و سنّت کی تعبیر کا جو اصول شریعت بل میں پیش کیا گیا ہے، ہمارے علماء حضرات عملاً اس کی نفی کرتے رہے ہیں۔ اس کی وضاحت کے لئے سود جیسے سنگین جرم کے بارے میں شرعی حکم کی وضاحت کیسے ہوگی۔ جب سود کی حرمت کے احکامات نازل ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، معاشرہ میں سودی کاروبار کی تفصیلات معلوم کرنے کے لئے منڈیوں اور کھیتوں میں تشریف لے گئے۔

(تفسیر مذاہب الرحمٰن جلد سوم صـ۱۱۱)

سننِ ابو داؤد کی روایت ہے کہ ایک کھیت میں آپ کی ملاقات ایک صحابی حضرت رافع بن خدیجؓ سے ہوئی جو کھیت کو پانی دے رہے تھے۔ آپؐ نے ان سے کاشت

کے اس معاملے کی تفصیلات معلوم کیں، تو حضرت رافعؓ نے بتایا کہ یہ زمین فلاں غیر حاضر زمیندار کی ہے اور وہ خود اس پر کاشت کر رہا ہے۔ جب فصل تیار ہوگی تو آدھی فصل مالکِ زمین کی ہوگی، اور آدھی اس کی۔ رسول اللہ صلعم نے ان تفصیلات کو سننے کے بعد فرمایا کہ یہ تو سودی معاملہ ہے۔ اسے ختم کر دیا جائے۔

اس کے ساتھ ہی اسی سننِ ابوداؤد میں حضرت جابرؓ کی روایت کردہ ایک حدیث ہے۔ جس کے مطابق رسول اللہ صلعم نے فرمایا کہ جو آدمی زمین کی بٹائی چھوڑنے پر تیار نہیں وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ لڑائی کرنے پر تیار ہو جائے۔

(سننِ ابوداؤد جلد سوم ص ۳۵۵)

آج بھی سود کی جو تعریف متعین کی جائے، اس کے مطابق، بٹائی کا معاملہ اس کے ذیل میں آتا ہے۔ بلکہ زمانۂ جدید کے مشہور ماہر معاشیات لارڈ کینز نے تو یہاں تک دعویٰ کیا ہے کہ قدیم زمانے میں سود کی سب سے بڑی صورت یہی بٹائی کا معاملہ تھا۔

(جنرل تھیوری صفحات ۲۴۲، ۳۴۳)

لیکن حیرت کی بات ہے کہ ہمارے علماء کی اکثریت اس سلسلے میں قرآن و سنّت کے احکامات اور ائمۂ مجتہدین کی تعبیر کے برعکس بٹائی کے سودی معاملے کو جائز قرار دیتی ہے۔ خیال رہے کہ چاروں فقہی مذاہب کے بانی جن میں حضرت امام ابوحنیفہؒ بھی شامل ہیں۔ اس معاملے کو حرام قرار دیتے ہیں۔ لطف کی بات تو یہ ہے کہ "قومی اتحاد" کی تحریک کے دوران، ان علماء حضرات نے جب یہ محسوس کیا کہ اس سودی معاملے کے ذریعے ملک کے کروڑوں انسانوں کا خون چوسا جا رہا ہے، تو انہوں نے اپنے منشور میں انہی آئمہ کے حوالے سے بٹائی کے معاملے کو حرام قرار دیا اور منشور میں قوم سے یہ وعدہ کیا کہ جب قومی اتحاد برسرِ اقتدار آئے گا تو وہ اس غیر شرعی طریقے کو ختم کر دے گا۔ اس منشور پر علماء کی دوسری جماعتوں کے علاوہ جماعتِ اسلامی نے بھی دستخط کئے تھے جس کے امیر نے کسی زمانے میں اس سودی کاروبار کو جائز ثابت کرنے کے لئے ایک پوری کتاب بعنوان "مسئلۂ ملکیتِ زمین" تصنیف فرمائی تھی، لیکن قومی اتحاد کو جو جزوی کامیابی ہوئی، اس کے بعد یہ علماء حضرات اپنے منشور سے پھر گئے اور اب دوبارہ ان کے نزدیک ان کی اپنی حرام کردہ چیز جائز قرار پا چکی ہے۔

اس مسئلہ کا ہمارے ملک کے کروڑوں انسانوں سے تعلق ہے اور قرآن و حدیث کے احکامات اور اس کی روشنی میں آئمۂ مجتہدین کے فتاویٰ سے ان کروڑوں انسانوں کا بھلا ہو سکتا ہے، بلکہ غیر حاضر زمینداری نظام کے خاتمے کا ہمارے ملک کی سیاسی حالت پر بھی خوشگوار اثر پڑ سکتا ہے۔ لیکن اس بارے میں ہمارے علماء حضرات قرآن و سنّت کی

ائمہ مجتہدین سے منقول تعبیر کی بجائے اپنی من مانی تعبیر کرتے ہیں، کبھی اس معاملے کو حرام قرار دے دیتے ہیں اور کبھی اسے جائز سمجھنے لگ جاتے ہیں۔ اس سے عامۃ الناس کے دلوں میں ایسے وساوس کا پیدا ہونا لازمی ہے کہ یہ حضرات قرآن وسنت کی صرف اسی تعبیر کو معتبر قرار دیں گے جو ان کے مزاج کے مطابق ہوگی۔ اس نکتے کی وضاحت ضروری ہے۔

اس بل کی دفعہ ۵ کے ذیل میں، یہ لازم قرار دیا گیا ہے کہ وفاقی شرعی عدالت کا دائرہ اختیار سماعت وفیصلہ بلا استثنیٰ تمام امور ومقدمات پر حاوی ہوگا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر شرعی عدالت کوئی ایسا فیصلہ دے جو آئمہ مجتہدین کی متفقہ تعبیر کے خلاف ہو، تو کیا اسے تسلیم کر لیا جائے گا، یا اس کی مخالفت کی جائے گی۔ اس بارے میں بل میں وضاحت ہونی چاہیئے۔ اس کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ ۳ فروری ۸۶ء کے قومی اخبارات میں، وفاقی شرعی عدالت کے ایک فیصلے کی تفصیلات شائع ہوئی ہیں۔ اس فیصلے کے مطابق، ایک اسلامی حکومت، زکوٰۃ اور عشر کے علاوہ دوسرے ٹیکس بھی عائد کر سکتی ہے۔ حالانکہ اس بارے میں آئمہ مجتہدین سے اس کے بالکل الٹ منقول ہے۔ امام عبدالوہاب الشعرانی نے اس امر پر جمہور ائمہ کا اجماع نقل کیا ہے کہ نظام زکوٰۃ کے ساتھ کوئی دوسرا ٹیکس نافذ نہیں کیا جا سکتا۔

(المیزان الکبریٰ جلد دوم ص ۲)

امید ہے کہ شریعت بل کو پیش کرنے والے علماء ان نکات کی وضاحت فرما کر، اس بارے میں عامۃ الناس کے شکوک رفع کریں گے۔

خریدار صاحبان متوجہ ہوں

خط وکتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیں۔

۱۔ بسا اوقات ادارہ ہذا کے نام جو منی آرڈر موصول ہوتے ہیں ان کے کوپنز (COUPONS) پر خریدار کا مکمل پتہ نہیں لکھا ہوا ہوتا۔ اس کا خاص خیال رکھا جائے تاکہ تعمیل میں بلاوجہ تاخیر نہ ہو۔

۲۔ پرچہ نہ ملنے کی اطلاع خریدار ماہ رواں کی پندرہ تاریخ تک بھیج دیں۔ اس صورت میں ہی پرچہ دوبارہ ارسال کیا جائے گا۔

۳۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی لفافہ ارسال کریں۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام

حقائق و عبر

علمائے حق ایک میز پر!

تحریک استقلال کے سربراہ ائر مارشل (ریٹائرڈ) اصغر خان نے اپنی جماعت کے بہاول پور زون کی مجلس عاملہ کے اجلاس میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے بتایا کہ علمائے حق کے ساتھ ان کے بڑے دیرینہ اور قریبی مراسم ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ان گہرے روابط کی وضاحت کے لئے یہ واقعہ بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ ۱۹۷۷ء کی تحریک میں سہالہ ریسٹ ہاؤس میں نظر بندی کے دوران پاکستان قومی اتحاد کے صدر مولانا مفتی محمود میرے پاس تشریف لائے اور فرمانے لگے کہ آپ کے مولانا شاہ احمد نورانی سے اچھے تعلقات ہیں جب کہ ہمارے دیوبند مکتب فکر اور ان کے بریلوی مکتب فکر میں معمولی مذہبی اختلافات ہیں۔ آپ ہمارے ثالث بن جائیں اور ہمارے اختلافی مسائل دُور کرا دیں تاکہ ہم اس اتحاد کو زیادہ قوی اور مضبوط بنا سکیں۔ ائر مارشل نے کہا کہ مولانا مفتی محمود کی وسعت نظری دیکھتے ہوئے میں نے ان سے ان کا مذہبی نقطہ نگاہ سنا اور پھر مولانا شاہ احمد نورانی کے خیالات معلوم کئے۔ لیکن مولانا نورانی کی طویل تشریحات سننے کے بعد مجھے افسوس ہے کہ میں اس مذہبی کشیدگی کو ختم کر کے انہیں ایک ٹیبل پر نہ لا سکا۔ اصغر خان نے کہا کہ اس واقعہ سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مذہب کو سٹیٹ سے علیحدہ رکھا جائے۔ کیونکہ ہمارے ملک میں کئی مذہبی فرقے موجود ہیں۔ اس لئے ہر شخص کو مکمل مذہبی آزادی ہونی چاہیئے۔

(ہفت روزہ چٹان لاہور بابت ۳۰ دسمبر ۸۵ صـ۲۹)

یہ کیسے علمائے حق ہیں جو ایک میز پر نہیں بیٹھ سکتے!

۲۔ جمعیت علمائے اسلام اور پاکستان

جمعیت علمائے اسلام کے ایک مقتدر رہنما مولانا سراج احمد دین پوری کا ایک انٹرویو حال ہی میں

ہفت روزہ "تکبیر" کراچی میں چھپا ہے۔ جس پر چٹان سمیت مختلف اخباروں اور رسائل میں سخت تنقید کی جا رہی ہے اس بارے میں چٹان کے مذکورہ بالا شمارہ میں دو علماء، جناب ابو طاہ خان اور حافظ ابو مغیرہ چوہان کے مقالے چھپے ہیں، جن میں مولانا دین پوری کے مندرجہ ذیل بیانات پر بڑے دکھ کا اظہار کیا ہے۔

۱۔ تحریک پاکستان کا نعرہ پاکستان کا مطلب کیا، لا الہ الا اللہ بالکل ڈھونگ تھا، مسلمانوں کو ابھارنے کے لئے بطور حربہ استعمال کیا گیا تھا۔ ورنہ پاکستان کے قیام کی وجہ معاشی تھی۔

۲۔ پاکستان میں نفاذ اسلام قطعی ممکن نہیں، نظام اسلام، جو کہ خلفائے راشدین اور صحابہ کرام کے زمانے میں تھا، اب نافذ نہیں ہو سکتا۔

۳۔ اسلام کا نفاذ حکومتی سطح پر قطعی ممکن نہیں اور اسلام کے نام پر، جو حکومت بنے گی، کامیاب نہیں ہو سکتی۔

(ہفت روزہ چٹان بابت دسمبر ۸۵ء صـ۲۱)

ان خیالات پر تنقید نگاروں کا مطالبہ ہے کہ جمعیت علمائے اسلام اس بارے میں اپنا مؤقف واضح کرے، لیکن اس طرف سے اس بارے میں خاموشی ہے۔

جمعیت کے ان مقتدر لیڈر صاحب کے ان خیالات پر واویلا کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ قیام پاکستان سے پہلے بھی ان کا یہی مسلک تھا اسی لئے انہوں نے اس کے قیام کی مخالفت کی تھی، اب اگر چالیس سال بعد انہوں نے اپنا مسلک سچ سچ بتا دیا ہے تو اس پر واویلا کرنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ سبق حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔

۳۔ قرآن مجید کے بلند مرتبہ مفسّر

روشن خیال دینی حلقوں میں یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ موجودہ جدید دور میں برصغیر ہندو پاکستان میں قرآن مجید کے بلند مرتبہ مفسّر مولانا حمید الدین فراہی تھے۔ اور ان کے بعد سرا نمبر ان کے شاگرد رشید مولانا امین احسن اصلاحی کا ہے، مولانا حمید الدین فراہی کے بارے میں یہ دعوے سن کر حیرت ہوتی تھی کہ اتنے بڑے پائے کا مفسّر قرآن ہونے باوجود انہوں نے قرآن مجید کی تفسیر کیوں نہ لکھی۔ اب مولانا امین احسن اصلاحی صاحب شاگرد جناب جاوید احمد الغامدی کے زیر ادارت شائع ہونے والے ماہنامے ق کی دسمبر ۱۹۸۵ء کی اشاعت سے یہ راز کھلا کہ وہ یہ کام کیوں نہ کر سکے ان ت زندگی بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:۔

اعظم گڑھ واپس آکر مولانا نے اپنے وطن "پھریہا" میں قیام فرمایا۔ خاندانی موروثی زمینداری کا کام کبھی کبھی دیکھ لیا کرتے تھے۔

(ماہنامہ اشراق بابت دسمبر ۸۵ء صـ۴۱)

قارئین طلوع اسلام جانتے ہیں کہ قرآن مجید نے سب سے بڑا حرام اور انسانیت کے خلاف سب سے بڑا جرم سود قرار دیا ہے، سود کے احکام نازل ہونے کے بعد، رسول اللہ صلعم نے زمینداری نظام یعنی اپنی زمین کسی دوسرے کے ذریعے کاشت کرا کے، پیداوار کے ایک حصے کو لینے کو خالص سود قرار دیا۔ (سنن ابوداؤد جلد دوم)

زمانہ جدید کے ماہرین معاشیات بھی یہی فرماتے ہیں کہ اُس زمانے میں سود کی سب سے بڑی صورت یہی زمینداری نظام تھا۔ (ملاحظہ ہو جنرل تھیوری ازلارڈ کینز صفحات ۲۴۲، ۳۴۳)

لیکن حیرت ہے کہ قرآن کے اس بلند پایہ مفسّر کو قرآن کے اعلان کردہ سب سے بڑے حرام کا علم نہ تھا۔ ہمیں تو یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان کے شاگرد رشید یعنی مولانا امین احسن اصلاحی صاحب جنہیں ان کے بعد سب سے بڑا مفسّر تسلیم کیا جاتا ہے کا ذریعہ روزگار بھی یہی زمیندار ہ کا کاروبار ہے۔ خدا کرے یہ اطلاع غلط ہو۔

۴۔ پیری مریدی کا چکر :

ہفت روزہ ایشیا نے اپنے ۵ جنوری ۱۹۸۶ء کے شمارے میں پیری مریدی کے کچھ واقعات کی تفصیلات بیان کر کے یہ صحیح تاثر دیا ہے کہ یہ کاروبار کسی خاص مذہب سے مخصوص نہیں ہے، اسے بلا کسی تبصرے کے نقل کیا جاتا ہے :۔

امان اللہ خاں والئی افغانستان نے جب یورپ سے واپسی پر اپنے پسماندہ اور رجعت پسند ملک کو نئی روشنی سے ہمکنار کرنا چاہا تو منجملہ دیگر اصلاحات کے ایک حکم یہ بھی دیا کہ پیری مریدی ممنوع ہے، لیکن مذہبی افغانوں کو پیر کا دامن چھوڑنے پر کیسے مجبور کیا جا سکتا تھا۔ دُکھی انسان پیر کے پاس نہ جائے تو کس کے پاس جائے۔

ایسے غیر فطری اور غیر معقول احکام کا نتیجہ یہ نکلا کہ امان اللہ خاں کے خلاف بغاوت ہو گئی۔ امان اللہ خاں کے بعد کسی حکومت نے نہ تو افغانستان کے اندر نہ افغانستان کے باہر پیری مریدی کو ممنوع قرار دیا۔ حتیٰ کہ ہمارے موجودہ مارشل لاء کے دور میں ایک سرکاری ملازم نے اس شغل کو اعلانیہ کیا تو بھی کسی کو ٹوکنے کی ہمت نہ ہوئی کہ جناب ایسے مشاغل قواعد ملازمت کے خلاف ہیں۔

یہ قصہ ایک سپاہی کا تھا جو پانی پر دم کر کے دیتا تھا تو مریض شفایاب ہو جاتا تھا۔ پہلے اس پیر سپاہی کی شہرت محدود تھی، پھر پھیلتے پھیلتے یہاں تک پہنچی کہ ہر شہر سے اس کے تقاضے ہونے لگے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ایک معمولی سپاہی ہونے کے باوجود اس کے دوروں کا انتظام ہوائی جہاز سے ہونے لگا جب کسی شہر میں اس کا پروگرام ہوتا تو لوگ جوق در جوق ہوائی اڈے پر پہنچ جاتے اور یہ منظر ہم نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ لوگ ڈبے کنستر اور برتن اٹھائے جوق در جوق لاہور ائرپورٹ کی جانب چلے جا رہے ہیں۔ لوگوں کے بے پناہ ہجوم کی وجہ سے وہ برتنوں پر ایک ایک کر کے پھونک مارنے کی بجائے ایک مچان پر کھڑے ہو کر اجتماعی دم کر دیتا تھا۔

کچھ لوگ تو ضرور ہی صحتیاب ہوتے ہوں گے جو اس کی شہرت پھیلی لیکن جب عوام کی کثیر تعداد ذاتی تجربے سے مایوس ہو گئی تو اس کی شہرت بھی ماند پڑنے لگی اور اب ایک مدت ہوئی ہے کہ اس کا نام بھی کبھی سننے میں نہیں آیا۔

شاید کچھ اسی سے ملتا جلتا قصہ جدید گورو رجنیش کا ہے جو بھارت سے نکل کر امریکہ میں جا مقیم ہوا اور یہاں بھی اس کی دکان اسی طرح چمک اٹھی جس طرح بھارت میں چلی تھی۔

لیکن یہ گرو پرانے زمانے کے نہیں، نئے زمانے کے ہیں۔ کسی زمانے میں پروفیسر رہ چکے ہیں، رواں انگریزی بول لیتے اور جدید فکری رجحانات سے بخوبی واقف ہیں۔

اب جو لوگ مغرب کے ترقی یافتہ اور جدید ہونے کا رومانوی تصور رکھتے ہیں وہ ذرا دیکھیں کہ مغرب کے عوام بھی کتنے بیوقوف ہیں۔ ان صاحب نے امریکہ کی ایک ریاست میں اپنا آشرم بنایا تو لوگ دیوانوں کی طرح ان کے پیچھے لگ گئے۔

وہ تو ان کے گھر کے بھیدیوں نے لنکا ڈھائی ورنہ ان کے سحر سے دنیا کا نکلنا مشکل تھا۔ پردہ چاک ہوا تو جسطرح وہ بھارت سے فرار ہو کر امریکہ پہنچے تھے اسی طرح الٹے پاؤں امریکہ سے بھارت پہنچ گئے ہیں۔ اس اکھاڑ پچھاڑ میں گرو صاحب کو ہتھکڑی بھی لگی۔

بھارت کے مشہور صاحب قلم جمنا داس اختر نے انکی بھارت واپسی پر شدید احتجاج کیا اور دہائی دی کہ کسی طرح عوام کو ان سے بچایا جائے۔

لکھتے ہیں :-

نام نہاد بھگوان رجنیش نے ایک سو سال سے زیادہ سزائے قید سے بچنے کے لئے امریکہ کی ایک عدالت میں، اپنے جرائم کا اقرار کیا اور کئی لاکھ ڈالر جرمانہ اور عدالتی خرچ کے طور پر ادا کرتے ہوئے کہہ دیا کہ میں توبہ کرتا ہوں اور ہندوستان واپس جا رہا ہوں، دوبارہ امریکہ آنے کا

نام نہیں لوں گا۔ اب یہ شخص ہندوستان لوٹ آیا ہے۔

اس شخص نے برسوں اپنے آپ کو بھگوان ظاہر کر کے لاکھوں انسانوں کو دھوکہ دیا وہ مغل حکمرانوں سے زیادہ شان و شوکت سے رہتا تھا۔ اس کے پاس اتنی بیش قیمت کاریں اور ہوائی جہاز تھے جو دنیا بھر میں کسی دوسرے انسان کو حاصل نہیں ہو سکتے تھے اس کی دولت امریکہ کے صدر سے بھی کئی گن زیادہ تھی۔ محنت کی بجائے محض چرب زبانی سے اس نے کروڑوں ڈالر کمائے۔ امریکہ میں اپنا نگر آباد کرنے کے لئے اس نے ہزاروں آدمیوں کی جعلی شادیاں کرائیں۔

۵۔ اخوان المسلمین اور اسرائیل

ہفت روزہ ایشیا نے اپنی ۵ جنوری ۱۹۸۶ء کی اشاعت میں یہ تسلیم کیا ہے کہ مصر کے سابق صدر سادات کے پولیٹیکل پارٹیز ایکٹ کے مطابق ہر رجسٹر ہونے والی سیاسی جماعت کے لئے لازمی ہے کہ وہ کیمپ ڈیوڈ سمجھوتے اور اسرائیل سے مصر کے معاہدہ امن کو تسلیم کرے اس معاہدے کے مطابق، مصر نے اسرائیل کو تسلیم کر کے اس سے سفارتی تعلقات قائم کر لئے۔ جو سیاسی پارٹی اس شرط کو پورا نہیں کر سکتی وہ رجسٹر نہیں ہو سکے گی۔

(ہفت روزہ ایشیا لاہور صـ۲۰)

مصر کی مشہور اسلامی جماعت الاخوان المسلمون اس شرط کو تسلیم کر کے، اپنے آپ کو رجسٹرڈ کرا چکی ہے، اس طرح اسرائیل کو تسلیم کرنے والی وہ سب سے پہلی اسلامی جماعت ہے۔

---

۶ اہلحدیث علماء کا مبلغ علم

پاکستان میں شائع ہونے والے مذہبی اخبارات و رسائل میں سے ہفت روزہ اہلحدیث واحد اخبار تھا، جو اہل سنت کے درود کی بجائے اہل تشیع کا درود استعمال کرتا تھا، اہل تشیع نے اپنے ایک خاص عقیدے کی تائید میں معروف درود کے الفاظ میں "آلہ" کا اضافہ کر دیا ہے۔ یہ اضافہ عربی قواعد کے مطابق درست نہ تھا۔ طلوعِ اسلام نے اہلحدیث کی توجہ اس طرف دلائی تو اس نے اس غلطی کی اصلاح کر دی۔ لیکن اتنی اخلاقی جرأت نہ تھی کہ طلوعِ اسلام کا شکریہ ادا کیا جاتا۔

تاہم اس کے قارئین نے اسے شرمندہ کیا کہ طلوعِ اسلام کے بارے میں وہ یہ جھوٹا پروپیگنڈا کرتے تھے کہ اسے عربی نہیں آتی اور اب اس نے اہلحدیث کی عربی کی ایک فحش غلطی پکڑ لی ہے اس شرمندگی کو مٹانے کے لئے اہلحدیث نے یہ معاملہ اپنے علماؤں کے سامنے پیش کیا انہوں نے

فتویٰ دیا کہ جو غلط درود اہلحدیث استعمال کرتا تھا وہی ٹھیک ہے اور اس کی دلیل میں اسلام کے مشہور نحوی امام سیبویہ کا ایک شعر نقل کیا۔ ان علاموں کی دیانتداری ملاحظہ ہو کہ امام سیبویہ اس نقطہ پر بحث کرتے ہوئے اعلان کرتا ہے کہ اسم ظاہر کا ضمیر مجرور پر عطف ڈالنا فحش غلطی ہے اور اس کے استعمال پر اصرار ایک قبیح فعل ہے، ہاں شعر میں وزن کی رعائت کی وجہ سے یہ جائز ہے اور اس کی مثال میں ایک شعر نقل کیا۔ لیکن اہلحدیث علاموں نے ان کی اصل بحث پر پردہ ڈال کر صرف وہ شعر ثبوت میں نقل کر دیا ہے، شاید اہلحدیث کے نزدیک دیانتداری کا یہی مفہوم ہے!

اس کے علاوہ انہوں نے دو آیات کا حوالہ دیا ہے، جس کا کمزور سہارا شیعہ حضرات لیتے ہیں۔ حالانکہ ان میں اسم ظاہر کی بجائے 'من' اسم موصول ہے اور امت مسلمہ کے جمہور علماء اور قراء نے اسے بھی غلط قرار دیا ہے بلکہ امام قرطبی نے تو دعوےٰ کیا ہے کہ جمہور ائمہ نے صحیح مسلم کی ایک حدیث کے حوالے سے اس غلط قاعدے کے استعمال پر اصرار کو رسول اللہ صلعم کی توہین قرار دیا ہے (بحوالہ الجامع لاحکام القرآن جلد پنجم صـ۴)

لیکن اہلحدیث کے نزدیک حدیث سے مراد غالباً رفع یدین اور آمین بالجہر کی حدیثیں ہیں۔ دوسری احادیث کو اگر وہ مانتے تو بٹائی کے معاملے اور سونے کے زیورات کی حرمت کے بارے میں درجنوں موجود صحیح احادیث کو بھی تسلیم کر لیتے جس سے کروڑوں انسانوں کا بھلا ہوتا۔

۷۔ جماعتِ اسلامی کی پریس سنسرشپ

حکومتیں پریس سنسرشپ کے لئے بدنام ہیں، لیکن ہماری سیاسی جماعتوں کا طرزِ عمل بھی اس بارے میں مختلف نہیں ہے۔ جماعتِ اسلامی کے ترجمان روزنامہ "جسارت" کے سابق چیف ایڈیٹر محمد صلاح الدین صاحب کا ایک انٹرویو ہفت روزہ چٹان لاہور کی ۲۰ جنوری ۱۹۸۶ء کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ جس میں انہوں نے بتایا ہے کہ انہیں جسارت کی ایڈیٹری سے کیوں علیحدہ کیا گیا۔ اس انٹرویو کی ایک جلی سرخی یہ ہے:۔

جسارت میں جماعتِ اسلامی کی مخالف جماعتوں کی خبریں شائع کی گئیں تو جماعت کے فائدین مجھ پر برسنے لگے۔

چنانچہ اس جرم کی پاداش میں انہیں جسارت کی ایڈیٹرشپ سے برخاست کر دیا گیا۔ جس کی وضاحت وہ ان الفاظ میں فرماتے ہیں:۔

"جسارت" سے علیحدگی کے سلسلہ میں میں ہمیشہ ایک مختصر سا جملہ استعمال کرتا رہا ہوں اور وہ یہ ہے کہ کسی ملازم ایڈیٹر کا اختلاف اگر حکومت سے ہو تو وہ اندر ہو جاتا ہے اور اپنے مالکان سے ہو تو باہر ہو جاتا ہے۔ جماعتِ اسلامی نے اب تک تین

روزنامے شائع کئے ہیں۔ پہلا روزنامہ "تسنیم" جو خود جماعت کا اپنا اخبار تھا۔ دوسرا روزنامہ "کوہستان" جو ایک آزاد اخبار تھا لیکن اسے خرید کر جماعت کا ترجمان بنا دیا گیا تھا۔ میری یہ سوچی سمجھی رائے ہے کہ ان دونوں اخبارات کی ناکامی کا سبب یہ تھا کہ انہیں مکمل اخبار کے بجائے صرف ایک جماعت کا بلیٹن بنا دیا گیا۔

۸۔ ۸½ سالہ دورِ نفاذِ اسلام کی شام کو

سال ۱۹۸۵ء اپنی تمام رعنائیاں اور تابانیاں دکھا کر اپنی آخری ہچکی لے کر غروب ہو گیا۔ اس کے ساتھ نئے سال کی خوشیاں اور مسرتیں عود کر آئیں۔ نئے سال کی خوشی میں لاہور کے بڑے ہوٹلوں میں خصوصی پروگراموں کا اہتمام کیا گیا جن میں بے فکر جوڑوں نے اپنے غمِ روزگار کو دُور کرنے کے لئے نئے سال کی خوشیوں سے حظ اٹھائے۔ عروس البلاد لاہور کی شاہراہوں پر چمکیلی اور تیز رفتار گاڑیوں میں سوار نوجوانوں نے مستی کے عالم میں فلک شگاف قہقہوں سے نئے سال کی آمد کا خیر مقدم کیا۔ نوجوانوں کے غول ان بستیوں کا رُخ کرتے رہے جہاں بسنے والوں کو شراب کے استعمال سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ اور رات گئے تک وہاں بوتلوں کے کاک اڑاتے رہے۔ لاہور کے چار ہوٹلوں میں ڈانس کا اہتمام کیا گیا اور فی جوڑا پانچ سے سات سو روپے وصول کئے گئے۔ ہوٹلوں میں ایڈوانس بکنگ میں ہی تمام نشستیں پُر ہو گئی تھیں اور آج شام کے بعد جن گاہکوں نے رقص و سرود کی ان محفلوں سے لطف اٹھانے کے لئے رجوع کیا۔ انہیں متعلقہ ہوٹلوں کی انتظامیہ کی طرف سے "سوری" کا مایوس کن لفظ سنائی دیا۔

روزنامہ نوائے وقت یکم جنوری ۸۶ء بحوالہ ہفت روزہ ایشیاء لاہور بابت ۱۲ جنوری ۱۹۸۶ء

۹۔ عالمی مساجد کونسل کے فیصلے

حال ہی میں سعودی عرب میں عالمی مساجد کونسل کا اجلاس ہوا جس میں جماعتِ اسلامی پاکستان کے امیر میاں طفیل محمد صاحب نے بھی شرکت کی، واپسی پر انہوں نے مساجد کونسل کے اہم فیصلوں کو ایک پریس کانفرنس میں پڑھ کر سنایا جنہیں ہفت روزہ ایشیاء نے اپنی ۱۹ جنوری کی اشاعت میں نقل کیا ہے۔ ان میں سے ایک فیصلہ یہ ہے:۔

اجلاس نے روس سمیت ان تمام ممالک کی مذمت کی جو اسرائیل کو افرادی قوت اور اسلحہ فراہم کر رہے ہیں اور اسرائیل کے وجود کو ہر قیمت پر قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ خیال رہے کہ روس واحد غیر اسلامی ملک ہے جس کے اسرائیل کے ساتھ سفارتی تعلقات

نہیں۔ مسلمانوں کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ امریکہ ہی اسرائیل کا مربّی ہے۔ جس نے پچھلے ایک ماہ میں دنیائے اسلام سے پیش کی جانے والی، دو قرار دادوں کو، سلامتی کونسل میں ویٹو کر دیا۔ معلوم نہیں کس مصلحت کے تحت اس مربی کا نام نہیں لیا جاتا۔

۱۰۔ زمانہ جدید کا سب سے بڑا عالم دین!

جماعت اہلحدیث کے ترجمان ہفت روزہ "الاعتصام" نے اپنی جنوری ۱۹۸۶ء کی اشاعت اپنی جماعت کے ایک عالم، حافظ محمد گوندلوی کی شخصیت کے لئے مخصوص کی ہے۔ اس خاص اشاعت کی ضخامت نوے صفحات ہیں اور اس میں مختلف اہل حدیث علماء نے حافظ صاحب کی خدمت میں نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ اس دور میں ان سے بڑا کوئی عالم دین پیدا نہیں ہوا اور وہ علم و عمل کے لحاظ سے صحیح معنوں میں سلف صالحین کی ایک یادگار تھے۔ ان کے مبلغ علم کا اندازہ لگانے کے لئے اس رسالے سے دو اقتباس پیش کئے جاتے ہیں۔ اس شمارے کے صفحہ سولہ پر ان کا یہ قول نقل کیا گیا ہے:۔

۱۔ ایک دن فرمایا، سید انور صاحب نے، شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب کے بارے میں لکھا ہے کہ امام محمد بن عبدالوہاب کند ذہن شخص تھے، اس پر مسکراتے ہوئے فرمایا، اگر وہ کند ذہن ہوتے تو تقلید کرتے۔ وہ تو تقلید سے کوسوں دور تھے۔ ایسے شخص کو کند ذہن کیسے کہا جا سکتا ہے!

حیرت کی بات ہے کہ اہلحدیث کے اس علامہ صاحب کو یہ تک معلوم نہ تھا کہ محمد بن عبدالوہاب نے خود متعدد مرتبہ اعلان کیا تھا کہ وہ امام احمد بن حنبل کے پیروکار ہیں۔ چنانچہ حنفی علماء کو کند ذہن ثابت کرنے کے لئے انہوں نے جو اصول وضع کیا۔ اس کی زد ان کے شیخ الاسلام پر بھی پڑتی ہے۔

۲۔ دوسرا واقعہ جلسے کی صدارت کے آداب کے بارے میں ہے، اس بارے میں لکھا ہے:۔

ایک جلسے میں حضرت حافظ گوندلوی صاحب نے صدارت فرمائی۔ اسی دوران میں ایک کتاب جو تقریباً پانچ صد صفحات پر مشتمل تھی آپ کے ہاتھ لگ گئی۔ آپ نے بیک وقت عظیم الشان جلسے کی صدارت بھی کی۔ اور کتاب کا مطالعہ بھی۔ ادھر جلسہ پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا اور ادھر کتاب کا مطالعہ مکمل ہو گیا۔ ہم نے کہا یہاں آپ نے اس کتاب کو کیا سمجھا ہوگا، مسکرا کر فرمایا۔ جہاں سے چاہو پوچھ لو۔ ہم نے بعض مقامات سے پوچھا۔ آپ نے بالکل صحیح جواب دیا۔

اس واقعہ سے جہاں حضرت محدث گوندلوی کی بے پناہ قوتِ حافظہ کا اندازہ ہوتا ہے وہاں ان کے بے انتہا ذوقِ مطالعہ کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اسی ذوقِ مطالعہ نے آپ کو بحر علم و حکمت کا

شناور بنا دیا۔ آپ شناور ہی نہیں بلکہ علومِ عالیہ و آلیہ کے بحرِ بیکراں تھے۔ عرب و عجم کے اربابِ فضل و کمال آپ کے علمی مرتبہ کے معترف تھے"۔

صدارت کی کرسی پر بیٹھ کر اگر کوئی صاحب دوسرے شغل میں مشغول ہو جائے تو اس کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے، انہیں شریفانہ الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اہلحدیث علماء ایسے صدارت کے آداب کے خلاف سمجھنے کی بجائے، اپنے استاد کے علمی مرتبے کا کمال قرار دے رہے ہیں۔

اس شمارے میں یہ تاثر دیا گیا ہے کہ اس وقت اہلحدیث جماعت کے جتنے علماء ہیں وہ سب حافظ صاحب کے شاگرد ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بھی اپنے استاد کی طرح رفع یدین اور آمین بالجہر کے مسائل میں الجھے ہوئے ہیں، اور انہیں اپنے استاد کی طرح رسول اللہ صلعم کی وہ صحیح احادیث نظر نہیں آئیں، جن میں آپؐ نے زمین کی بٹائی کے معاملے کو سود قرار دے کر، غریب مسلمانوں کو زمینداروں کے استحصال سے بچایا تھا۔

مطالب الفرقان جلد ششم

اس میں سورۃ الاعراف کی آیات (۱۵۹ تا ۲۰۶)، سورۃ الانفال کی کل آیات (۱ تا ۷۵)، سورۃ توبہ کی کل آیات (۱ تا ۱۲۹) سورۃ یونس کی کل آیات (۱ تا ۱۰۹) اور سورۃ ھود کی کل آیات (۱ تا ۱۲۳) آگئی ہیں، جو بیشتر مشتمل ہیں۔ حضراتِ انبیاء سابقہ کے کوائفِ حیات اور اقوامِ گذشتہ کے نہایت عبرت خیز واقعات پر، جو احباب سلسلۂ مطالب الفرقان کا مطالعہ کر چکے ہیں وہ جانتے ہیں کہ تعریفِ آیات کے اصول کے مطابق جس طرح قرآنِ مجید کی تفسیر، ان مجلدات میں پیش کی جا رہی ہیں اس سے قرآنی حقائق کس طرح نکھر کر سامنے آجاتے ہیں۔

یہ جلد اعلیٰ درجہ کے سفید کاغذ کے (۴۳۶) صفحات پر پھیلی ہوئی ہے کتابت، طباعت، جلد، سابقہ جلدوں کے معیار کے مطابق، عمدہ اور دلکش
قیمت فی جلد -/۷۵ روپے۔ محصول ڈاک -/۸ روپے

ملنے کا پتہ

(۱) ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵۔ بی گلبرگ ۲ لاہور
(۲) مکتبہ دین و دانش۔ چوک اردو بازار لاہور

جماعتِ اسلامی اور عائلی قوانین!

جماعتِ اسلامی نے ابتداء ہی سے عائلی قوانین مجریہ ۱۹۶۱ء کی مخالفت کر کے سیاسی مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کی۔ حالیہ مارشل لاء کے دوران جماعت کی مارشل لاء حکومت سے مفاہمت ہوگئی تھی، اس لئے اس دوران اس نے ان قوانین کی مخالفت ترک کر دی۔ اب مارشل لاء کے اٹھتے ہی اس نے دوبارہ عائلی قوانین کی منسوخی کا مطالبہ شروع کر دیا ہے۔ جماعت کے جن اہلِ علم نے مودودی صاحب کی کتاب "حقوق الزوجین" کا مطالعہ کیا ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ عائلی قوانین اسلام کے خلاف نہیں۔ لیکن چونکہ ان کی مخالفت سے سیاسی مفاد حاصل ہوتے ہیں اس لئے وہ ان کی مخالفت کرنے والوں میں پیش پیش ہیں۔

مودودی صاحب کے جن عقیدتمندوں نے، مودودی صاحب کی مذکورہ بالا کتاب کا مطالعہ نہیں کیا، ان کی راہنمائی کے لئے ان کی اس کتاب کا عائلی قوانین کے ساتھ مختصر تقابلی مطالعہ پیش کیا جاتا ہے، جس سے ان پر یہ حقیقت واضح ہوجائے گی کہ مودودی صاحب کی کتاب حقوق الزوجین اور عائلی قوانین مجریہ ۱۹۶۱ء اصل میں دونوں ایک ہیں۔ ان میں صرف زبان کا فرق ہے، اور ان کی مخالفت سیاسی مفاد حاصل کرنے کے سوا کچھ نہیں۔

ہمارے ملک میں سنہ ۱۹۶۱ء میں جو عائلی قوانین نافذ ہوئے وہ ان مصری عائلی قوانین کا چربہ تھے، جو مصر میں سنہ ۱۹۲۹ء میں نافذ کئے گئے تھے۔ اس وقت ہمارے علماء نے ان کی خوب خوب تعریف کی۔ جناب مودودی صاحب بھی ان تعریف کرنے والوں میں پیش پیش تھے اور انہوں نے ایک مستقل کتاب کی صورت میں انہیں اردو زبان کا جامہ پہنایا۔ ان کی یہ کتاب حقوق الزوجین کے نام سے مشہور ہے۔ ان کا تقابلی مطالعہ ملاحظہ ہو:

صغر سنی کی شادی

صغر سنی کی شادیوں سے ہمارے معاشرے میں جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، ان کی طرف اشارہ

کرتے ہوئے، مودودی صاحب نے اپنی اس کتاب میں فرمایا :۔

"اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ کم سنی کے نکاحوں کی روک تھام کی جائے، اور کم از کم ایسے نکاحوں کو لازم قرار نہ دیا جائے۔ کیونکہ اکثر لڑکے، جن سے ابتداء میں اچھی توقعات قائم کی جاتی ہیں، آگے چل کر سخت بداخلاقیوں اور بری عادتوں اور فاسد اعتقادات میں مبتلا ہو جاتے ہیں"

(حقوق الزوجین جلد ششم مطبوعہ لاہور ص ۱۱۹)

عائلی قوانین میں ایسی شادیوں کی روک تھام کے لئے، شادی کے لئے لڑکے اور لڑکی کی عمر بالترتیب اٹھارہ اور سولہ سال مقرر کر دی گئی تھی۔

نکاح کی رجسٹریشن

ہمارے ہاں ننانوے فیصد شادیاں ایسی ہوتی ہیں، جن میں شادی سے پہلے بھی حقِ مہر ادا نہیں کیا جاتا ہے۔ صرف کاغذی خانہ پُری ہوتی ہے۔ اور یہ حق مہر بعد میں بھی عام طور پر ادا نہیں کیا جاتا اس سے ہمارے معاشرے میں مختلف قسم کی خرابیاں پیدا ہو رہی تھیں، ان خرابیوں کی اصلاح کے لئے جناب مودودی صاحب نے تجویز فرمایا :۔

لیکن اگر مہر مؤجل ہو (یعنی بعد میں ادا کیا جانا ہو) تو لازم قرار دیا جائے، اور زرِ مہر پر پچاس فیصدی کا اسٹامپ لگایا جائے۔ اسٹامپ کے بغیر یا پچاس فیصدی سے کم قیمت کے اسٹامپ پر کوئی دستاویزِ مہر، قابلِ ادخالِ دعویٰ نہ ہو۔ اس قسم کا ضابطہ اگر بنا دیا جائے، تو مہرِ مؤجل کا یہ سرتاپا عیب بآسانی مسدود ہو جائے گا۔

(ایضاً ص ۱۲۵)

ان بھاری اخراجات کی رجسٹریشن کی بجائے، عائلی قوانین میں صرف سادہ فارموں پر اندراج کو کافی سمجھا گیا لیکن اب جماعتِ اسلامی والے اس اندراج کو خلافِ اسلام قرار دے رہے ہیں۔ حالانکہ مودودی صاحب نے اسے خود تجویز کرتے ہوئے یہ فرمایا تھا کہ اس سے بہت سے جھگڑے ختم ہو سکتے ہیں۔

تعددِ ازواج

تعددِ ازواج کی وجہ سے معاشرے میں جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، ان کے بارے میں جناب مودودی صاحب فرماتے ہیں :۔

قرآن مجید میں تعددِ ازواج کی اجازت، عدل کی شرط کے ساتھ دی گئی ہے۔ اگر کوئی شخص عدل نہ کرے، تو اسے اس مشروط اجازت سے فائدہ اٹھانے کا حق نہیں۔ خود اس

آیت میں، جہاں تعددِ ازدواج کی اجازت دی گئی ہے، صاف حکم موجود ہے کہ اگر عدل نہ کر سکو تو ایک ہی بیوی رکھو۔ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ جو شخص دو یا زائد بیویوں کے درمیان عدل نہیں کرتا۔ اور ایک طرف جھک کر، دوسری کے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی کرتا ہے، وہ ظالم ہے، تعدد ازدواج کی اجازت سے فائدہ اٹھانے کا اس کو کوئی حق نہیں ہے، قانون کو ایسی حالت میں اُسے صرف ایک بیوی رکھنے پر مجبور کرنا چاہیئے۔ اور دوسری بیوی یا بیویوں کو، اُس کے خلاف قانون سے دادرسی پانے کا حق ہونا چاہیئے۔

(ایضاً صفحات ۴۱، ۴۲)

عائلی قوانین میں تعددِ ازدواج پر ایسی ہی پابندی لگائی گئی ہے!

طلاقِ بدعت

ہمارے ہاں ایک ہی مجلس میں بیٹھے بیٹھے لوگ طلاق کا لفظ تین دفعہ بول کر، اپنی بیوی کو جدا کر دیتے تھے، فقہاء کی اصطلاح میں اسے طلاقِ بدعت کہتے ہیں کیونکہ اس کی ابتداء بعد میں ہوئی۔ یہ طلاق خلافِ اسلام تھی اور اس سے معاشرے میں بہت سی خرابیاں پیدا ہو رہی تھیں۔ عائلی قوانین میں طلاق کے اس طریقے کو خلافِ قانون قرار دے کر، طلاق کے اسلامی طریقے کو قانوناً رائج کیا گیا۔ تو جماعتِ اسلامی سمیت علماء نے اس کی مخالفت شروع کر دی۔ حالانکہ اس سے پہلے اس طلاق کے بارے میں مودودی صاحب خود یہ تحقیق پیش کر چکے تھے ملاحظہ ہو:۔

"بیک وقت تین طلاق دے کر، عورت کو جدا کر دینا، نصوصِ صریحہ کی بناء پر معصیت ہے" علمائے امت کے درمیان اس مسئلہ میں جو کچھ اختلاف ہے، وہ صرف اِس امر میں ہے کہ ایسی تین طلاقیں، ایک طلاق رجعی کے حکم میں ہے یا تین طلاق مغلظ کے حکم میں، لیکن اس کے بدعت اور معصیت ہونے میں کسی کو اختلاف نہیں، سب تسلیم کرتے ہیں کہ یہ فعل اس طریقے کے خلاف ہے، جو اللہ اور اس کے رسولؐ نے طلاق کے لئے مقرر کیا ہے، اور اس سے شریعت کی اہم مصلحتیں فوت ہو جاتی ہیں، حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص نے، اپنی بیوی کو بیک وقت تین طلاقیں دیں تو حضورؐ غصّے میں آکر کھڑے ہو گئے اور فرمایا کہ اللہ عزّ و جل کی کتاب سے کھیل کیا جاتا ہے۔ حالانکہ ابھی میں تمہارے درمیان موجود ہوں۔ (ایضاً ص ۱۵۲)

لیکن جب عائلی قوانین میں اللہ کی کتاب کے ساتھ یہ کھیل ختم کیا گیا، تو جماعتِ اسلامی نے اس اقدام کی مخالفت شروع کر دی۔

جس طرح شریعتِ اسلامی نے، شادی کا معاہدہ ختم کرنے کے لئے، مرد کو طلاق کی اجازت دی ہے، اسی طرح بیوی کو خلع کا اختیار دیا ہے کہ اگر وہ کسی وجہ سے

اپنے خاوند کو ناپسند کرتی ہے تو وہ اپنے خاوند کو ناپسند کرتی ہے تو وہ اس سے علیحدگی اختیار کر سکتی ہے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے مودودی صاحب نے فرمایا:۔

"شرعِ اسلامی نے جس طرح مرد کو یہ حق دیا ہے کہ جس عورت کو وہ ناپسند کرتا ہے اور جس کے ساتھ وہ نباہ نہیں کر سکتا۔ اُسے طلاق دے دے، اسی طرح عورت کو بھی یہ حق دیا ہے کہ جس مرد کو وہ ناپسند کرتی ہو، اور کسی طرح اس کے ساتھ گزر بسر نہ کر سکتی ہو، اس سے خلع حاصل کر لے۔ (ایضاً صـ۶۰)

عائلی قوانین میں عورت کے اس حق کو تسلیم کیا گیا ہے!

علماء کو ڈانٹ

مودودی صاحب نے جب عائلی قوانین کے بارے میں ان خیالات کو پیش کیا تو قدامت پسند علماء نے ان پر سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا، لیکن مودودی صاحب نے ان کی ناپسندیدگی کی کوئی پرواہ نہ کی، بلکہ مندرجہ ذیل الفاظ میں انہیں سخت ڈانٹ پلائی:۔

"قیامت کے روز حق تعالیٰ کے سامنے، ان گنہگاروں کے ساتھ ساتھ اُن کے دینی پیشوا بھی پکڑے ہوئے آئیں گے، اور اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا کہ کیا ہم نے تم کو علم و عقل سے اس لئے سرفراز کیا تھا کہ تم اس سے کام نہ لو، کیا ہماری کتاب اور ہمارے نبی کی سنت تمہارے پاس اس لئے تھی کہ تم اس کو لئے بیٹھے رہو اور مسلمان گمراہی میں مبتلا ہوتے رہیں، ہم نے اپنے دین کو آسان بنایا تھا۔ تم کو کیا حق تھا کہ اسے مشکل بنا دو، ہم نے تم کو قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا حکم دیا تھا۔ تم پر یہ کس نے فرض کیا کہ ان دونوں سے بڑھ کر اپنے اسلاف کی پیروی کرو۔ ہم نے ہر مشکل کا علاج قرآن میں لکھا تھا، تم سے یہ کس نے کہا کہ قرآن کو ہاتھ نہ لگاؤ اور اپنے لئے انسانوں کی لکھی ہوئی کتابوں کو کافی سمجھو۔ اس باز پرس کے جواب میں امید نہیں کہ کسی عالمِ دین کو کنز الدقائق اور ہدایہ اور فتاویٰ عالمگیری کے مصنفوں کے دامن میں پناہ مل سکے۔" (ایضاً)

مودودی صاحب کی اس ڈانٹ کو سامنے رکھا جائے تو خود جماعتِ اسلامی والوں سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن پوچھے گا کہ وہ تیس سال تک ان قوانین کو کہ جب وہ مودودی صاحب کی کتاب حقوق الزوجین میں درج تھے، حق سمجھتے رہے۔ اور جب حکومت نے انہیں نافذ کیا تو انکی مخالفت کرنے لگے۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب، جو عائلی قوانین میں جماعتِ اسلامی سے بھی سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں وہ بھی جب جماعتِ اسلامی میں شامل تھے، مودودی صاحب کی یہ کتاب پڑھتے رہے۔ اُس وقت انہیں اس میں کوئی سفارش خلافِ اسلام نظر نہ آئی، لیکن جب انہیں عائلی قوانین مجریہ ۱۹۶۱ء کی صورت میں نافذ کیا گیا تو وہ یکایک خلافِ اسلام ہو گئیں۔ کیا وہ اپنے اس دوغلے طرزِ عمل کے اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہ نہ ہوں گے۔ (محمد شاہد عادل)

عائلی قوانین

قرآن کریم کی روشنی میں

۱۔ نکاح

قرآنِ کریم کی رُو سے، ایک مرد اور عورت کا ان تمام ذمہ داریوں اور حقوق کو لئے ہوئے جو اللہ تعالےٰ نے اس باب میں متعین کئے ہیں، میاں بیوی کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے کا معاہدہ "نکاح" کہلاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اسے مِیْثَاقًا غَلِیْظًا (۴/۲۱)۔ "پختہ عہد" سے تعبیر کیا ہے۔

اس معاہدہ کی شرائط

معاہدہ کوئی بھی ہو، اس کے لئے ضروری ہے فریقین بالغ ہوں اور وہ معاہدہ، ان کی باہمی رضامندی سے کسی قسم کے جبر و اکراہ کے ہو۔ قرآنِ کریم نے معاہدۂ نکاح کے لئے، ان دونوں شرطوں کو ضروری قرار دیا ہے۔ اس نے بلوغت کے لئے "نکاح کی عمر" کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ سورۂ نساء میں ہے:۔

بلوغت

وَابْتَلُوا الْیَتٰمٰی حَتّٰٓی اِذَا بَلَغُوا النِّکَاحَ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَیْهِمْ اَمْوَالَهُمْ (۴/۶)

(تم جب یتیموں کے سرپرست ہو تو) انہیں پرکھتے رہو تا آنکہ وہ "نکاح کی عمر" کو پہنچ جائیں۔ پھر اگر تم ان میں عقل کی پختگی پاؤ تو ان کے مال و متاع ان کے حوالے کردو۔

س کہا گیا ہے کہ جب یتیم "نکاح کی عمر" کو پہنچ جائیں تو ان کے مال ان کے حوالے کر دو۔ اور سورہ م میں ہے: حَتّٰی یَبْلُغَ اَشُدَّهٗ (۶/۱۵۳)۔ جب وہ "جوانی کی عمر" تک پہنچ جائیں۔ اس سے ظاہر کہ قرآنِ کریم کی رُو سے "نکاح کی عمر" جوانی ہے۔ جب تک لڑکا اور لڑکی جوان نہ ہو جائیں، وہ نکاح

کی عمر کو نہیں پہنچتے۔ لہٰذا، قرآن کی رو سے نابالغ کی شادی نہیں ہو سکتی کیونکہ وہ نکاح کی عمر کو نہیں پہنچتا۔ یہ جو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ نکاح کے وقت حضرت عائشہ رضؓ کی عمر چھ سال کی تھی، تو یہ بالکل غلط ہے۔ نکاح کے وقت ان کی عمر سترہ اور انیس برس کے درمیان تھی۔

(ب) نکاح کے لئے باہمی رضامندی ضروری ہے۔ چنانچہ مردوں کے متعلق ہے: فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ (۴/۳) "تم ایسی عورتوں سے شادی کرو جو تمہیں پسند ہوں"۔ اور عورتوں کے متعلق کہا کہ: لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا۔ (۴/۱۹)۔ تمہارے لئے قطعاً جائز نہیں کہ تم عورتوں کے زبردستی مالک بن جاؤ۔ ایسا کرنا حلال ہی نہیں"۔

لہٰذا، جس نکاح میں مرد اور عورت دونوں کی رضامندی شامل نہیں، وہ نکاح، قرآن کی رُو سے نکاح ہی نہیں کہلا سکتا۔

چونکہ کم سنی میں نکاح ہو نہیں سکتا، اس لئے نکاح کے لئے ولی (سرپرست) کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بالغ لڑکی کا کوئی ولی نہیں ہوتا۔ وہ اپنے معاملات کی خود مختار ہوتی ہے۔

۲۔ نکاح سے مقصد

(ا) نکاح سے مقصد محض جنسی جذبہ کی تسکین نہیں بلکہ ان تمام ذمہ داریوں کا پورا کرنا ہے جو نکاح سے عائد ہوتی ہیں۔ اگر کوئی شخص محض جنسی جذبہ کی تسکین کے لئے "نکاح" کرتا ہے، اور ان ذمہ داریوں کی پرواہ نہیں کرتا جو نکاح کی رُو سے عائد ہوتی ہیں، تو قرآن کریم کی رُو سے وہ حقیقی معنوں میں نکاح نہیں ہوتا۔ اس نے، اس کی وضاحت مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ (۴/۲۴) کہہ کر دی ہے۔ "مُحْصِنِيْنَ" کے معنی ہیں، حدود و قیود کے اندر رہنے کے لئے۔ اور مُسَافِحِيْنَ سے مراد ہے محض جنسی جذبہ کی تسکین کے لئے۔

حقوق و فرائض

(ب) نکاح سے، مرد اور عورت دونوں پر یکساں حقوق اور یکساں فرائض عائد ہوتے ہیں۔ سورۂ بقرہ میں ہے: وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ[1] (۲/۲۲۸) قاعدے اور قانون کے مطابق، عورت کے حقوق بھی اتنے ہی ہیں جتنی اس کی ذمہ داریاں ہیں۔

(ج) میاں بیوی کے تعلقات ایسے خوشگوار ہونے چاہئیں کہ اس سے گھر میں کامل سکون اور اطمینان پیدا ہو۔ قرآن کریم کی رُو سے "ازواج" (جوڑوں) کا مطلب ہی یہ ہے کہ لِتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا (۳۰/۲۱) ان سے تسکین حاصل ہو، اور باہمی محبت اور رفاقت پیدا ہو۔ وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً (۳۰/۲۱) ایسے گھر کو خدا، جنت سے تعبیر کرتا ہے (۲/۲۲۱) اس کے برعکس، جس میاں بیوی میں ہم آہنگی خیالات نہ ہوں، ان کے گھر کو وہ جہنم کہہ کر پکارتا ہے (۲/۲۲۱)۔

مروّجہ قانون

حالیہ نافذ کردہ عائلی قوانین کی رُو سے، نابالغ لڑکی یا لڑکے کے نکاح کو غیر قانونی قرار دیا گیا ہے اور یہ قرآن کی منشاء کے مطابق ہے۔ علماء حضرات اس کی مخالفت کرتے ہیں۔

---

[1] اس آیت میں جو ہے وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ۔ تو اس کا مفہوم "طلاق اور عدّت" کے عنوان میں بیان کیا جائے گا۔

رجسٹریشن

چونکہ نکاح ایک معاہدہ ہے اس لئے اسے ضبطِ تحریر میں لے آنا، اور سرکاری ریکارڈ میں درج کرا دینا ہی بہتر ہے۔ مستقبل میں پیدا ہونے والے بہت سے جھگڑے مٹ جاتے ہیں۔ قرآن کریم نے تو باہمی لین دین کے معاملات کو تحریر میں لانے کی سخت تاکید کی ہے (۲/۲۸۲)۔ نکاح کا معاہدہ اس سے بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔

حالیہ عائلی قوانین میں، اس معاہدہ کو سرکاری رجسٹر میں درج کرانے کی تاکید کی گئی ہے۔ اور مولوی صاحبان اس کی مخالفت کرتے ہیں۔

۲۔ مہر

چونکہ ازدواجی میزان میں، عورت کا پلڑہ، بمقابلہ مرد کے، جھکتا ہے (یعنی عورت کی قدر و قیمت مرد کے مقابلہ میں زیادہ ہے) اس لئے مرد کے لئے ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ کچھ تحفہ عورت کو دے۔ اسے مہر کہا جاتا ہے۔ یہ مہر کسی بات کا معاوضہ نہیں ہوتا۔ بلکہ کسی قسم کے معاوضہ کے خیال کے بغیر، بطور تحفہ دیا جاتا ہے۔ اس کے لئے قرآن کریم نے نِحْلَةً کا لفظ استعمال کیا ہے (۴/۴) جس کے معنی ہیں "بلا بدل"۔

(ب) قرآن نے مہر کی کوئی مقدار مقرر نہیں کی۔ جو کچھ بھی باہمی رضامندی سے طے ہو جائے وہ مہر ہے۔ لیکن چونکہ اس کا ادا کرنا ضروری ہے، اس لئے اسے علیٰ قدرِ وسعت ہونا چاہیئے۔ (دیکھئے ۲/۲۳۶ ز ۴/۲۰)۔

(ج) مہر، عورت کی ملکیت ہوتا ہے اور کسی کو حق نہیں کہ اُسے اس سے محروم کر دے۔ البتہ عورت اپنی رضامندی سے اس میں سے کچھ چھوڑ بھی سکتی ہے (۴/۴)۔

(د) اگر کسی وجہ سے مہر مقرر نہ کیا گیا ہو تو اُسے مرد کی وسعت کے مطابق طے کر لینا چاہیئے (۲/۲۳۶)۔

مروّجہ قانون حالیہ عائلی قوانین میں کہا گیا ہے کہ اگر شادی کے معاہدہ میں مہر کی ادائیگی کے طریق کار کے متعلق کوئی تفصیل موجود نہ ہو تو مہر کی کل رقم کے متعلق یہ تصوّر کیا جائے گا کہ وہ عند الطّلب واجب الادا ہے۔ قرآن کریم میں مؤجل اور معجّل کی کوئی تفریق نہیں۔

۳۔ طلاق

طلاق کے معنی ہیں۔ "نکاح کے معاہدہ سے آزاد ہو جانا"۔ چونکہ یہ معاہدہ فریقین (مرد اور عورت) نے باہمی رضامندی سے استوار کیا تھا اس لئے ان میں سے کسی ایک کو اس کا حق نہیں پہنچ سکتا کہ جب جی چاہے، اپنی مرضی سے اس معاہدہ کو منسوخ کر دے۔ اس میں دوسرے فریق کے حقوق کا تحفظ ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اسے انفرادی فیصلہ پر نہیں چھوڑا بلکہ معاشرہ کو حکم دیا ہے کہ وہ اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے۔ (معاشرہ سے مراد وہ نظام ہے جو متنازعہ فیہ معاملات میں فیصلہ کرنے کے لئے اسلامی مملکت کی طرف سے قائم ہو۔ اسے عدالت کہا جائے گا)۔ چنانچہ اس باب میں، سورۃ النساء میں ہے:۔

اگر تم کسی میاں بیوی میں، باہمی اختلاف۔ جھگڑے یا مخالفت (شقاق) کا خدشہ محسوس کرو، تو ایک ثالثی بورڈ بٹھاؤ جس میں ایک ممبر مرد کے خاندان کا اور ایک عورت کے خاندان کا ہو۔ اس بورڈ کی کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ وہ ان دونوں میں مصالحت کرائے۔ اگر انہوں نے ایسا کیا تو امید کی جا سکتی ہے کہ میاں بیوی

میں موافقت کی صورت پیدا ہو جائے گی۔ (۴/۳۵)

(۲) اگر ثالثوں کی کوشش سے ان میں موافقت کی صورت نکل آئے تو ہوا المراد۔ لیکن اگر وہ اپنی کوشش میں ناکام رہیں تو ظاہر ہے کہ انہیں اس معاملہ کی رپورٹ اس عدالت کے پاس بھیجنی ہو گی جس نے انہیں ثالث مقرر کیا تھا۔ وہ عدالت فیصلہ کرے گی کہ فریقین میں طلاق ہو جانی چاہیئے۔ اور اس کی شرائط کیا ہوں گی۔ عدالت کے اس فیصلہ کا نام طلاق ہو گا۔

طلاق کے بارے میں حالیہ عائلی قوانین میں دو ایک بنیادی نقص ہیں، جن کا دور کیا جانا ضروری ہے۔

(ا) اس میں کہا گیا ہے کہ جو شخص اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہے وہ طلاق کا اعلان کرنے کے فوری بعد، اس امر کی اطلاع (نوٹس) یونین کے چیئرمین کو دے۔

(اا) چیئرمین، ایک ثالثی کونسل مقرر کرے گا تاکہ فریقین میں مصالحت کرائی جائے۔

اگر مصالحت نہ ہو سکے تو، نوٹس کی تاریخ سے نوّے دن کے بعد، طلاق مؤثر ہو جائے گی۔

یعنی معاہدہ نکاح منسوخ تصوّر ہو گا۔

شق (ا) میں نقص یہ ہے کہ:-

(ا) اس میں مرد کو حق دیا گیا ہے کہ وہ جب جی چاہے، طلاق کا اعلان کر دے۔ یہ خلافِ قرآن ہے۔ اس شق کو یوں تبدیل کر دینا چاہیئے کہ:-

جو شخص اپنی بیوی کو طلاق دینے کا ارادہ کرے، اسے چاہیئے کہ اپنے اس ارادہ کی اطلاع چیئرمین کو دے۔

اس صورت میں مصالحت کے کچھ معنی بھی ہوں گے۔ ورنہ، طلاق کا اعلان کر دینے کے بعد، ثالثی بورڈ کا تقرر اور مصالحت کی کوشش، بے معنی چیز ہے۔

(ب) دوسرا بنیادی نقص یہ ہے کہ اس میں طلاق کے اعلان کا حق مرد کو دیا گیا ہے۔ عورت کو نہیں۔ عورت کے متعلق کہا گیا ہے کہ:-

اگر طلاق کا حق باضابطہ طور پر بیوی کو دیا گیا ہو تو (وہ طلاق کا اعلان کر کے ثالثی کونسل کی طرف رجوع کر سکتی ہے)۔

"بیوی کو طلاق کا حق باضابطہ طور پر دینے" کا مطلب کچھ نہیں۔ معاہدۂ نکاح کی رُو سے، میاں اور بیوی دونوں کو یکساں حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ اس لئے جن حالات میں، مرد، طلاق حاصل کرنے کا حق رکھتا ہے، انہی حالات میں عورت بھی ویسا ہی حق رکھتی ہے۔ یہ بات تو بڑی تعجب انگیز سی ہو گی کہ معاہدہ تو فریقین کی رضامندی سے ہو اور اس کے فسخ کرنے یا کرانے کا حق صرف ایک فریق کو حاصل ہو۔ دوسرے کو حاصل نہ ہو!

مروّجہ قانون کی رُو سے، اگر بیوی کو، "باضابطہ طلاق کا حق" نہ دیا گیا ہو، تو اسے تنسیخ نکاح کے لئے عدالت میں مقدمہ دائر کرنا پڑتا ہے۔ میاں اور بیوی کے لیئے، الگ الگ قوانین، قرآن کے منشأ کے خلاف ہے۔

لہٰذا اس شق کا طلاق میاں اور بیوی دونوں پر یکساں ہونا چاہیئے۔ یہ ترمیم نہایت ضروری ہے۔ اس کے بغیر مرد کو یہ حق ہر وقت رہتا ہے کہ وہ جب جی چاہے طلاق کا اعلان کر دے۔ اس کے بعد ثالثی کونسل میں جا کر کہدے میں مصالحت کرنے پر تیار نہیں۔ ثالثی کونسل اس میں کچھ نہیں کر سکے گی۔ مرد طلاق دے چکا۔ وہ طلاق مؤثر ہو گی۔ یہ وہی ظلم ہے جو مردوں کے ہاتھوں عورتوں پر ہوتا چلا آ رہا ہے۔ اس قانون نے اس ظلم میں کسی قسم کی کمی یا اصلاح نہیں کی۔ لہٰذا، اس شق کی صورت یوں ہونی چاہیئے کہ:-

میاں یا بیوی میں سے جو کوئی، معاہدۂ نکاح کو فسخ کرنے کا ارادہ کرے، اسے چاہیئے کہ اس امر کی اطلاع چیئرمین کو دے۔۔۔۔۔۔

شق (ز)

میں کہا گیا ہے کہ اگر مصالحت نہ ہو سکے تو نوٹس کی تاریخ کے نوّے دن بعد، طلاق مؤثر سمجھی جائے گی۔ (نوّے دن بطور عدّت رکھے گئے ہیں)۔

قرآن کی رُو سے

(ا) طلاق اس دن ہو گی جب عدالت فیصلہ کرے کہ فریقین کا معاہدۂ نکاح فسخ کیا جاتا ہے۔ عدّت بھی اُسی وقت سے شروع ہو گی۔

(ب) عدّت کی مدّت، مختلف حالات میں مختلف ہے۔ قرآنِ کریم میں یہ تفصیلی طور پر مذکور ہے۔ وہی مدّت ہمارے قانون میں درج ہونی چاہیئے۔ موجودہ شق ناقص ہے۔

نوٹ:- ان تمام معاملات میں، عائلی قوانین کی رُو سے، یونین کونسل اور اس کے چیئرمین کو مجاز قرار دیا گیا ہے، ہماری رائے میں اس کی جگہ کسی باقاعدہ عدالت کو یہ اختیارات حاصل ہونے چاہئیں۔[۱]

مولوی صاحبان کی طرف سے طلاق کے متعلق اس پوری کی پوری شق کی سخت مخالفت ہوئی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:-

(۱) مرد کو حق حاصل ہے کہ جب چاہے۔ طلاق، طلاق، طلاق کہکر بیوی کو گھر سے نکال دے۔ عورت کو ایسا حق حاصل نہیں۔

(۲) اگر عورت گلو خلاصی کرانا چاہے تو اسے عدالت کی طرف رجوع کرنا ہو گا اور اسے ثابت کرنا ہو گا کہ وہ واقعی علیحدگی کی مستحق ہے۔ اسے طلاق نہیں بلکہ خلع کہا جاتا ہے جس کے لئے عورت کو "حق مہر" چھوڑنا پڑتا ہے۔

(۳) یہ بات مرد کے اختیار میں ہے کہ وہ عورت کو طلاق کا حق تفویض کرے یا نہ کرے۔

۴۔ طلاق کے بعد

عدالت کے فیصلہ سے نکاح منسوخ ہو گیا۔ اس کے بعد، عدّت کے دوران، یہ عورت کسی دوسرے مرد سے نکاح نہیں کر سکتی۔ لیکن اگر یہ (سابقہ) میاں بیوی چاہیں تو آپس میں شادی کر سکتے ہیں۔

---

[۱] اب اس کے لئے فیملی کورٹ کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ (سنہ ۱۹۷۹ء)

(ب) جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، عِدّت کے دوران یہ عورت کسی دوسرے مرد سے شادی نہیں کر سکتی۔ لیکن مرد پر اس کی کوئی پابندی نہیں۔ وہ جب چاہے، کسی دوسری عورت سے شادی کر سکتا ہے، بس یہ ایک "زائد حق" ہے جو عورت کے مقابلہ میں مرد کو حاصل ہے۔ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (۲/۲۲۸) میں اسی زائد حق کی طرف اشارہ ہے۔

(ج) اگر یہ سابقہ میاں بیوی چاہیں تو عدّت کی مدّت کے بعد بھی آپس میں شادی کر سکتے ہیں۔ اگر انہوں نے (عدّت کے دوران یا اس کے بعد) آپس میں شادی کر لی لیکن اس کے بعد پھر، مذکورہ بالا طریقہ کے مطابق، ان میں طلاق ہو گئی، تو دوسری مرتبہ بھی یہ میاں بیوی، عدّت کے دوران یا عدّت کے بعد، آپس میں شادی کر سکتے ہیں۔ (یہ دوسری مرتبہ کی طلاق کے بعد کی، شادی ہو گی)۔

لیکن اگر ان میں پھر طلاق کی نوبت آجائے (یعنی تیسری مرتبہ طلاق ہو جائے) تو پھر یہ میاں بیوی آپس میں شادی نہیں کر سکتے، نہ عدّت کے دوران، نہ اس کے بعد۔ قرآن میں ہے۔ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ص فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ م بِاِحْسَانٍ ط (۲/۲۲۹) "طلاق دو مرتبہ کی ایسی ہے جس کے بعد تم، قاعدے کے مطابق، عورت کو (نکاح میں) روک سکتے ہو یا حسن کارانہ انداز سے رخصت کر سکتے ہو" لیکن تیسری مرتبہ کی طلاق کے بعد تم آپس میں نکاح نہیں کر سکتے، یہ مطلب ہے "تین طلاق" سے۔

عائلی قانون

میں یہ شق قرآن کریم کی منشاء کے مطابق ہے۔ البتہ اس میں ذیل کے اضافے کی ضرورت ہے۔ یعنی

(د) اگر اس عورت کو نئے خاوند سے طلاق مل جائے۔ یا وہ فوت ہو جائے، تو پھر یہ عورت، اگر چاہے تو اپنے سابقہ خاوند سے شادی کر سکتی ہے۔ (۲/۲۳۰)۔

مولوی صاحبان اس شق کے بھی سخت خلاف ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مرد کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ جب چاہے، تین دفعہ (طلاق۔ طلاق۔ طلاق) کہہ دے۔ اس کے بعد وہ عورت اس پر حرام ہو جائے گی۔ اس کے پھر سے حلال ہونے کی ایک ہی شکل ہے کہ یہ عورت (خواہ ایک رات کے لئے) کسی دوسرے آدمی سے نکاح کرے۔ اس کے ساتھ شب بسری کرے۔ دوسری صبح وہ مرد اسے طلاق دے دے۔ اس کے بعد یہ اپنے سابقہ خاوند سے نکاح کر سکتی ہے۔ اس طریق کو حلالہ کہتے ہیں۔

(۰)

۵۔ تعدّدِ ازدواج (ایک سے زیادہ بیویوں سے نکاح)

ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کریم کی رُو سے، نکاح سے مقصد یہ ہے کہ انسان امن و سکون کی زندگی بسر کر سکے۔ میاں بیوی میں باہمی محبّت اور رفاقت کا تعلق ہو جس سے گھر "جنّت" بن جائے۔ اس مقصد کے پیشِ نظر اس نے تاکید کی ہے کہ بیوی (یا میاں) کے انتخاب میں، خیالات اور نظریات کی موافقت کا خیال رکھا جائے۔ نکاح، فریقین کی رضامندی سے، بغیر کسی قسم کے جبر و اکراہ کے ہو۔ اس قدر احتیاط کے باوجود، اگر تجربہ بتائے کہ انتخاب صحیح نہیں تھا اور اس رشتے کا نباہ مشکل ہے، تو نکاح کا معاہدہ فسخ کر لیا جائے، اور کسی دوسری عورت (یا مرد) سے

شادی کر لی جائے۔ سورۂ نساء میں ہے: وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ..... (۴/۲۰) "اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی سے نکاح کرنا چاہو (تو اس طریق کے مطابق جس کا ذکر طلاق کے عنوان میں کیا جا چکا ہے)۔ پہلی بیوی سے معاہدۂ نکاح فسخ کر لو، اور پھر دوسری عورت سے شادی کرو۔ اس سے واضح ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے، شادی کا اصول "ایک وقت میں ایک بیوی" (MONOGAMY) ہے۔

ہنگامی حالات

(۲) لیکن قرآن کریم اسے بھی تسلیم کرتا ہے کہ بعض اوقات ایسے ہنگامی حالات پیدا ہو سکتے ہیں جن کے پیشِ نظر، اس اصولی قانون میں، استثناء کی ضرورت لاحق ہو جائے۔ اس قسم کے حالات اسلام کے ابتدائی دور میں، مدینہ کی زندگی میں پیدا ہو گئے تھے۔ اس وقت کیفیت یہ تھی کہ:-

(۱) مسلمانوں کی ایک محدود سی جماعت تھی (جنگِ بدر میں، جو ۲ھ میں ہوئی تھی، مسلمان مجاہدین کی تعداد صرف ۳۱۳ تھی)۔

(۲) مسلسل لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا جو رسول اللہؐ کی پوری مدنی زندگی میں جاری رہا۔

(۳) ان لڑائیوں کی وجہ سے، اس مختصر سی جماعت میں، نوجوان افراد کی کمی ہوتی چلی گئی اور بیوائیں اور یتیم بچے دن بدن زیادہ ہوتے گئے ان کے علاوہ مسلمان عورتیں، مکہ میں اپنے غیر مسلم خاوندوں کو چھوڑ کر، مدینہ کی طرف آنا شروع ہو گئیں۔

(۴) مسلمان عورتیں، صرف مسلمان مردوں سے شادی کر سکتی تھیں۔ کسی غیر مسلم سے نہیں کر سکتی تھیں۔ حتیٰ کہ اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) سے بھی نہیں۔

(۵) لہٰذا، اُس وقت صورت یہ پیدا ہو گئی کہ بیواؤں کی۔ اور شادی کے قابل لڑکیوں کی تعداد، مردوں کے مقابلہ بہت زیادہ ہو گئی۔ بیواؤں کے ساتھ ان کے چھوٹے چھوٹے بچے یتیم اور لاوارث رہ گئے۔

(۶) ان ہنگامی حالات میں، اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ "ایک بیوی" کے اصولی قانون میں استثناء (EXCEPTION) کر دی جائے۔ اس مقصد کے پیشِ نظر، قرآن نے کہا کہ:-

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً ..... (۴/۳)

اس آیت کے تین حصے ہیں اور تینوں کا ترجمہ اور مفہوم حسبِ ذیل ہے۔

(۱) وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى .....

اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم یتامیٰ کے ساتھ انصاف نہیں کر سکو گے ..... تو

عربی زبان میں "یَتٰمٰی" یتیم بچوں کو بھی کہتے ہیں اور ان عورتوں کو بھی جن کے شوہر نہ ہوں۔ (خود قرآنِ کریم میں یَتَامَى النِّسَاءِ انہی معنوں میں آیا ہے۔ ۴/۱۲۷) لہٰذا آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ اگر ایسے حالات پیدا ہو جائیں جس میں تم دیکھو کہ معاشرہ میں یتیم بچے اور بے شوہر کی عورتیں زیادہ ہو گئی ہیں، اور ایک مرد۔ ایک عورت کے اصول کے مطابق، ان کے مسئلہ کا منصفانہ حل نہیں مل سکتا تو کیا کرو؟

(۲) فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ

ان میں سے جو عورتیں تمہیں پسند ہوں، ان سے نکاح کر لو۔ دو، دو۔ تین، تین۔ چار، چار تک یعنی ایسی صورت میں "ایک بیوی" کے اصول میں استثناء کر لو اور ان بے شوہر عورتوں کو اپنے خاندان کا جزو بنا لو۔ جتنی ان کی تعداد ہو اُس لحاظ سے۔ مقصد یہ ہے کہ یہ لاوارث عورتیں اور ان کے بچے، مختلف خاندانوں میں جذب ہو جائیں۔

(۳) فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً۔

لیکن اگر تمہیں خدشہ ہو کہ تم عدل نہیں کر سکو گے، تو پھر وہی "ایک بیوی" کا اصول برقرار رہے گا۔

بات بالکل صاف ہے۔ "عدل" کے متعلق قرآنِ کریم نے آگے چل کر کہہ دیا کہ جہاں تک جذبات کا تعلق ہے، ان میں یکسانیت کا سلوک تو ناممکن ہے۔ اتنی احتیاط رکھو کہ کسی ایک کی طرف اتنا نہ جھک جاؤ کہ دوسری ادھر لٹکی رہ جائے (۴/۱۲۹) —— کہاں وہ بیوی جو تمہاری عمر بھر کی رفیقہ ہے۔ جس کی وجہ سے گھر جنّت کا نمونہ بن رہا ہے۔ اور کہاں یہ، جسے تم محض معاشرہ کی ایک اجتماعی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے جزوِ خاندان بنا رہے ہو۔ تمہارے جذبات دونوں کے ساتھ یکساں نہیں ہو سکتے۔ لیکن اس سے یہ نہ ہو کہ یہ نو آمدہ —— جو بیچاری پہلے ہی مصیبت زدہ۔ بیکس اور لاوارث ہے —— نہ اِدھر کی رہے نہ اُدھر کی۔

پہلی بیوی کی رضامندی

یہ بھی ظاہر ہے کہ دوسری بیوی لانے کے لئے، پہلی بیوی کی رضامندی ضروری ہے۔ اس لئے کہ:-

(i) قرآنِ کریم نے ازدواجی زندگی کا مقصد یہ بتایا ہے کہ میاں بیوی میں باہمی محبت اور رفاقت کے تعلقات ہوں اور گھر میں سکون و اطمینان رہے۔ ظاہر ہے کہ اگر دوسری شادی، پہلی بیوی کی مخالفت کے باوجود کی جائے، تو پہلی بیوی کے ساتھ محبت اور موانست کیسے رہ سکتی، اور گھر میں سکون و اطمینان کہاں باقی رہے گا؟ ایسا ہونا ناممکن ہے! اس لئے پہلی بیوی کی عدم رضامندی سے دوسری بیوی لائی ہی نہیں جا سکتی۔ قرآن کا یہ منشاء نہیں کہ کسی اُجڑے ہوئے کنبہ کو آباد کرنے کے لئے، اپنے بستے رَستے گھر کو ویران کر دیا جائے۔

(ii) قرآنِ کریم نے دوسری شادی کے لئے عدل کی شرط عائد کی ہے۔ ظاہر ہے کہ جب پہلی بیوی، دوسری شادی کی مخالفت کر رہی ہو، اور اس کی مخالفت کے علی الرغم دوسری بیوی گھر میں آجائے، تو پہلی بیوی سے عدل کس طرح ہو سکے گا؟

(iii) قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ اگر میاں بیوی میں ناچاقی ہو جائے تو ایک ثالثی بورڈ قائم کرو تاکہ ان دونوں میں مصالحت کرا دی جائے۔ اگر ان میں مصالحت نہ ہو سکے تو پھر نکاح فسخ کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ جب دوسری شادی، پہلی بیوی کی مخالفت کے باوجود کی جائے گی، تو (پہلے) میاں بیوی میں ناچاقی اُسی وقت شروع ہو جائے گی، اور اس ناچاقی کی وجہ وہ ہوگی (یعنی دوسری بیوی) جس کی موجودگی میں مصالحت کی کوئی صورت ہی نہیں ہو سکے گی۔ اس کی صورت یہی ہو گی کہ یا پہلی بیوی کو (ناحق) طلاق دے دی جائے، یا دوسری بیوی کو چھوڑ دیا جائے۔

یہ چیز کہ دوسری شادی کے لئے، پہلی بیوی کی رضامندی ضروری ہے، خود نبی اکرمؐ کے ایک ذاتی فیصلہ سے

بھی ثابت ہے۔

ایک دفعہ حضرت علی رضؓ نے دوسرا نکاح کرنا چاہا۔ آنحضرت (صلعم) کو معلوم ہوا تو سخت برہم ہوئے۔ آپؐ نے مسجد میں خطبہ دیا۔ اس میں اپنی ناراضی کی۔ فرمایا۔ "میری لڑکی میرا جگر گوشہ ہے۔ جس سے اُسے دکھ پہنچے گا، مجھے اذیت ہوگی" چنانچہ حضرت علی رضؓ اس ارادے سے باز آگئے، اور حضرت فاطمہ رضؓ کی زندگی تک دوسرا نکاح نہ کیا۔

سیرۃ النبیؐ علامہ شبلی۔ جلد دوم صفحہ ۶۲۷۔ بحوالہ بخاری)

ظاہر ہے کہ رسولؐ اللہ نے جو کچھ اپنی بیٹی کے متعلق فرمایا ہے اس کا اطلاق اُمت کی ہر بیٹی پر ہوگا۔ اس لئے جس دوسرے نکاح سے پہلی بیوی کو دکھ پہنچے، وہ رسول اللہؐ کے اس فیصلہ کے مطابق بھی جائز نہیں قرار پا سکتا۔ کہا جائیگا کہ پہلی بیوی، دوسری شادی کی اجازت کیسے دے گی! سو پہلی بات تو یہ ہے کہ جن کے حالات کے پیش نظر قرآن نے دوسری شادی کی اجازت دی ہے، ان میں مومن عورتیں، اپنے خانماں برباد، لاوارث، بے کس بہنوں کی امداد کے لئے یقیناً آگے بڑھ آئی ہونگی (اور انہی جیسے حالات میں، مومن عورتوں سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ آگے بڑھیں گی)۔ علاوہ ازیں دوسری بیوی بھی، پہلی بیوی کے سر پر سوار ہونے کا جذبہ لے کر نہیں آئے گی۔ وہ اس کی ممنونِ احسان ہوگی۔

لیکن اس کے باوجود، اگر پہلی بیوی کسی وجہ سے، دوسری شادی کے حق میں نہیں، تو دوسری شادی کی اجازت نہیں ہو سکتی۔

بے شوہر کی عورتوں کا منصفانہ حل اسی صورت میں مل سکتا ہے جب وہ اس طرح جزوِ خاندان بنائی جائیں کہ گھروں کا امن و سکون قائم رہے اور پہلے میاں بیوی میں محبت اور رفاقت کا تعلق بدستور باقی رہے۔ اگر اس سے گھر جہنم بن جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے ایک مشکل کا حل تلاش کرتے کرتے دس مشکلات اور پیدا کر لیں۔

(۰)

دوسری شادی کے لئے، قرآنِ کریم میں صرف یہی ایک آیت ہے جسے اوپر درج کیا جا چکا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ دوسری شادی کے لئے تین شرطیں ضروری ہیں۔

اوّل۔ بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کے مسئلہ کی موجودگی۔

دوم۔ پہلی بیوی کی رضامندی۔ اور

سوم۔ عدل۔

حضورؐ کا اسوۂ حسنہ

اگر ان میں سے کوئی ایک شرط بھی موجود نہیں تو قرآن کی رُو سے دوسری شادی کی اجازت نہیں۔ نہ ہی مقصدِ اوّل کے علاوہ کسی اور مقصد کے لئے دوسری شادی کی اجازت ہے۔

خود نبی اکرمؐ کا اسوۂ حسنہ بھی اس پر دلالت کرتا ہے۔

(۱) حضورؐ نے پچیس سال کی عمر تک شادی نہیں کی اور ساری جوانی سپیدۂ سحر کی طرح بے داغ رہی۔

(۲) پچیس سال کی عمر میں ایک صاحبِ اولاد، بیوہ سے شادی کی جن کی عمر اُس وقت چالیس سال کی تھی۔

(۳) جب تک وہ بیوی (حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضؓ) زندہ رہیں، حضورؐ نے دوسری شادی نہیں کی، حالانکہ ان کی عمر وفات کے وقت قریب پینسٹھ سال بھی زیادہ تھی۔ یعنی بیوی کی اس قدر عمر رسیدگی کے باوجود، دوسری شادی کا خیال تک نہیں کیا۔ (واضح رہے کہ اس وقت حضورؐ کی نرینہ اولاد بھی کوئی نہیں تھی ــــ جو لڑکے پیدا ہوئے تھے وفات پا چکے تھے)۔

(۴) حضرت خدیجہ رضؓ کی وفات کے بعد صرف ایک شادی ہے جو حضورؐ نے غیر شادی شدہ عورت (حضرت عائشہ رضؓ) سے کی۔ (اور وہ اس وقت جب ہنوز جنگوں کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا)۔ باقی تمام نکاح، ان ہنگامی حالات میں ہوئے جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے، اور ان عورتوں سے جو (کئی کئی بار کی) بیوہ یا مطلقہ تھیں اور لاوارث و بے کس، بالعموم عمر رسیدہ۔ مقصد اس سے ان محتاجوں اور بے کسوں کی پناہ دہی تھی۔ چنانچہ باسورتھ سمتھ (BOSWORTH SMITH) اس باب میں لکھتا ہے کہ:۔

محمدؐ کی شادیوں کی توجیہہ جس طرح دیگر مقاصد کے تحت کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح اس مقصد کے تحت بھی کہ اس سے کس مپرس، بے نوا افراد کے حالات پر ترس کھانا مقصود تھا۔ یہ شادیاں ان عورتوں سے ہوئیں جو قریب قریب سب کی سب بیوہ تھیں اور نہ اپنے حسن و جمال اور نہ مال و دولت کی بنا پر کوئی شہرت رکھتی تھیں۔ بلکہ صورتِ حالات اس کے بالکل برعکس تھی۔

(MOHAMMAD AND MOHAMMADANISM)

باقی رہا یہ کہ ان شادیوں میں، پہلی ازواجِ مطہرات رضؓ کی رضامندی شامل ہوتی تھی۔ سو اس کا ثبوت یہ ہے کہ روایات کی رو سے یہ (پہلی بیویاں) ہر نئی آنے والی بیوی کا خیر مقدم کرتی تھیں اور اسے مبارکباد دیتی تھیں۔ اگر یہ شادیاں ان کی مرضی کے خلاف ہوتیں تو وہ آنے والی کے استقبال اور مبارکباد کے لئے کبھی آگے نہ بڑھتیں[۱]۔

ــــــ (۰) ــــــ

حالیہ عائلی قوانین

حالیہ عائلی قوانین میں اگرچہ یہ کہا گیا ہے کہ ثالثی کونسل کی منظوری کے بغیر دوسری شادی نہیں کی جا سکتی لیکن اس کے لئے صرف پہلی بیوی کی رضامندی کو شرط قرار دیا گیا ہے۔ قرآنی شرط کا کوئی ذکر نہیں۔

لیکن ہمارے علماء حضرات پر اتنی سی شرط بھی سخت گراں گذر رہی ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ مرد کو بلا شرط حق حاصل ہے کہ جب چاہے چار تک بیویاں کر لے۔ اس کے اس حق پر کسی قسم کی پابندی عائد کرنا! "شریعت" کے خلاف ہے۔ چار بیویوں کے علاوہ، وہ لونڈیاں رکھنے کا حق بھی برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔

۶۔ وراثت

حالیہ عائلی قوانین میں ایک شق یہ بھی ہے کہ:۔

---

[۱] ہم نے اس جگہ، اور دیگر مقامات پر حضورؐ کے اسوۂ حسنہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے ان روایات کو ہم اس لئے صحیح مانتے ہیں کہ وہ قرآن کریم کی تعلیم کے مطابق ہیں۔ یہی، روایات کے صحیح یا غلط ہونے کا بنیادی معیار ہے۔

اگر وراثت کے شروع ہونے سے پہلے، مورث کے کسی لڑکے یا لڑکی کی موت واقع ہو جائے تو ایسے لڑکے یا لڑکی کے بچوں کو (اگر کوئی ہوں) بحصّہ رسدی وہی ملے گا جو اس لڑکے یا لڑکی کو (جیسی کہ صورت ہو) زندہ ہونے کی صورت میں ملتا۔

یہ بات حسبِ ذیل نقشہ سے سمجھ میں آسکے گی:

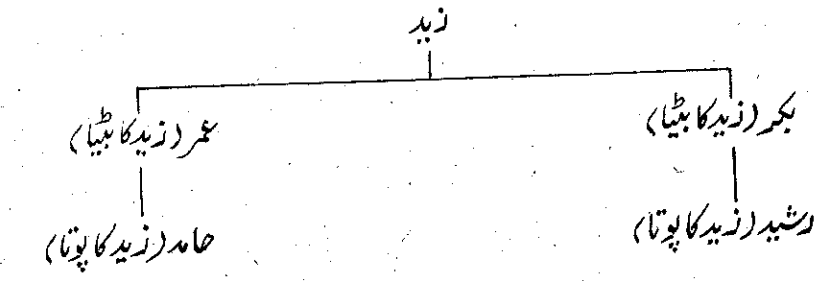

اگر زید کی زندگی میں بکر فوت ہو جائے تو رشید یتیم رہ جائے گا۔ اس کے بعد جب زید کی وفات ہوگی تو، حضرات علمائے کرام کے ارشاد کے مطابق، زید کی جائداد میں سے رشید (یتیم پوتے) کو کچھ نہیں ملے گا۔ ساری جائداد عمر کو مل جائے گی۔ رشید اپنے دادا کی جائداد سے اس لئے محروم کر دیا گیا کہ وہ بچارا یتیم رہ گیا تھا!

عائلی قوانین میں کہا گیا ہے کہ (یہ اس یتیم کے ساتھ بڑی بے انصافی ہے)۔ زید کی وفات پر، رشید کو وہی حصّہ ملنا چاہیئے جو اس کے باپ کو ملتا۔ یہ قانون قرآنِ کریم کی تعلیم کے مطابق ہے۔ اس سلسلہ میں ہم تفصیل کے ساتھ لکھ چکے ہیں۔ لیکن ہمارے مولوی صاحبان اس کے بھی سخت مخالف ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ زید کے ترکہ سے اس کے یتیم پوتے کو کچھ نہیں ملنا چاہیئے۔

(۰)

اسمبلی میں پیش کردہ تحریک

تصریحاتِ بالا سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ عائلی قوانین میں جو کچھ کہا گیا ہے، ان میں سے کوئی شق بھی قرآنِ کریم کے خلاف نہیں۔ بعض شقوں کو قرآنِ کریم کے احکام کے مطابق کرنے کے لئے کچھ ترمیمات کی ضرورت ہے۔ لیکن اصولی طور پر ان میں کوئی بات قرآنِ کریم کے خلاف نہیں۔ ان قوانین کی رُو سے، عورتوں اور یتیم اولاد کو وہ حقوق دلانے کی طرف پہلا قدم اٹھایا گیا ہے جو قرآنِ کریم نے انہیں عطا کئے تھے لیکن جن سے انہیں، بدقسمتی سے محروم کر دیا گیا تھا۔

لیکن قوم کی بدنصیبی ملاحظہ ہو کہ ہماری نیشنل اسمبلی کے پہلے سیشن (منعقدہ جون-جولائی ۱۹۶۲ء) میں یہ تحریک پیش کر دی گئی کہ ان قوانین کو منسوخ قرار دیا جائے اور ان کی بجائے، وہی پرانے قوانین رائج کر دیئے جائیں جن کی رو سے:-

(۱) والدین (یا دیگر سرپرست) نابالغ لڑکوں اور لڑکیوں کی شادی جس جگہ جی چاہے کر دیں۔

(۲) مرد کو یہ حق حاصل ہو کہ وہ جب جی چاہے، طلاق۔ طلاق۔ طلاق کہہ کر اپنی بیوی کو الگ کر دے۔ لیکن اگر بیوی کسی

کسی ظالم خاوند کے پنجہ سے رہائی حاصل کرنا چاہے تو اسے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑے۔

(۳) مرد کو حق حاصل ہو کہ جب چاہے، دو(۲)۔ تین(۳)۔ چار(۴) تک بیویاں کرلے۔ اور

(۴) یتیم پوتے کو اس کے دادا کی وراثت سے محروم رکھا جائے۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہ چاروں شقیں قرآنِ کریم کے احکام کے خلاف ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ جو بات قرآن کے خلاف ہے وہ اسلام کے بھی خلاف ہے۔ لیکن اب اصرار ہے کہ قانون یہی رائج ہونا چاہیئے۔ غنیمت ہے کہ عائلی قوانین کو منسوخ کرنے کی تحریک کا فیصلہ پہلے سیشن میں ہی نہیں ہو گیا۔ طے یہ پایا ہے کہ اسے پہلے "اسلامی مشاورتی کونسل" کی طرف بھیجا جائے۔

بدقسمتی سے ملک میں فضا ایسی پیدا کر دی گئی ہے کہ جو مسئلہ سامنے آتا ہے، اس پر دلائل و براہین اور علم و بصیرت کی روشنی میں، ٹھنڈے دل سے غور کرنے کے بجائے، عوام کے جذبات کو بھڑکا دیا جاتا ہے۔ اور اس طرح، دین و دانش، سب اس سیلاب کی رَو میں بہ جاتے ہیں۔ اس کے لئے دلیل یہ دی جاتی ہے کہ ایسا صدیوں سے ہوتا چلا آرہا ہے، اس لئے اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی۔ اسے کوئی نہیں دیکھتا کہ، جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے وہ قرآنِ مجید کے بھی مطابق ہے؟

ظاہر ہے کہ یہ دلیل کسی صورت میں بھی صحیح نہیں قرار دی جا سکتی۔ صحیح مسلک یہ ہے کہ ہمارے لئے صحیح اور غلط کا اوّلین اور بنیادی معیار، خدا کی کتاب ہے۔ ہمیں تمام جذبات اور رجحانات سے الگ ہو کر دیکھنا یہ چاہیئے کہ اس باب میں وہ کتاب ہمیں کیا راہ نمائی دیتی ہے۔ ہمارے آئین میں یہ شق موجود ہے کہ پاکستان میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں ہو گا جو اسلام کے خلاف ہو۔ ہم مرکزی مجلسِ قانون ساز اور (مجوزہ) اسلامی مشاورتی کونسل کے اراکین سے بالخصوص، اور ملک کے دوسرے سمجھنے سوچنے والے طبقہ سے بالعموم درخواست کریں گے کہ جو کچھ گذشتہ صفحات میں پیش کیا گیا ہے وہ اس پر نہایت ٹھنڈے دل سے غور کریں اور پھر از خود اس نتیجہ پر پہنچیں کہ مسلمانوں کی عائلی زندگی سے متعلق کون سے قوانین، اسلام کے مطابق ہیں۔ اس ضمن میں اس بنیادی اصول کو پیشِ نظر رکھیئے (اور ہمیں یقین ہے کہ آپ کا اس پر ایمان ہو گا) کہ:-

جو چیز قرآن کے خلاف ہو گی وہ کبھی اسلام کے مطابق
نہیں ہو سکتی۔

(ختم مقالہ ۱۹۶۲ء)

(۰)

یہ (عائلی) قوانین اب تک رائج ہیں لیکن اب بڑی شدّت کے ساتھ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ انہیں، منسوخ کر دیا جائے۔ آہ بیچاری حوّا کی بیٹی! ؎

میری مینائے غزل میں تھی ذرا سی باقی
شیخ کہتا ہے کہ ہے یہ بھی حرام اے ساقی

(۰)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

افکارِ پرویز کی صدی

(مسلسل)

تعدادِ ازواج

تعدادِ ازواج کے متعلق راولپنڈی کے ایک سائل کے جواب میں "باب المراسلات" کے صفحات میں محترم پرویز صاحب نے لکھا:۔

قرآن کریم میں یہ اصول کہ عام حالات میں ایک ہی بیوی کی اجازت ہے، مذکور ہے۔ خود سورۂ نساء میں جہاں خاص حالات میں تعداد ازواج کی اجازت دی گئی ہے یہ موجود ہے کہ "اگر تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً (۴/۳) "اگر تم عدل نہ کر سکو تو پھر ایک ہی عورت رکھو" اس سے ظاہر ہے کہ عام اصول ایک ہی بیوی سے رشتۂ مناکحت کا ہے۔ صرف خاص حالات میں بشرطِ عدل، ایک سے زائد کی اجازت ہے۔ مثنیٰ وثلث ورباع (دو، تین اور چار) کے الفاظ خود اس پر شاہد ہیں کہ عام اصول ایک ہی کا ہے۔ خاص حالات میں اجازت دو سے شروع ہوتی ہے اور چار تک جا کر رُک جاتی ہے۔

اسی سورہ میں چند آیات آگے جا کر، طلاق سے متعلقہ احکام میں ہے کہ وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ (۴/۲۰) "اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی کرنا چاہو" وَاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا اور اگر تم اسے سونے کا ڈھیر بھی دے چکے ہو تو اس سے کچھ واپس نہ لو، یعنی اگر موجودہ بیوی سے نباہ نہ ہو تو اسے طلاق دو اور اس کے بعد دوسری عورت سے شادی کرو۔ اس آیت کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ اس میں صرف "ایک بیوی

کی جگہ دوسری بیوی کرنے" کا ذکر ہے اس لئے ہوسکتا ہے کہ ایک شخص کی چار بیویاں ہوں اور وہ ان کی جگہ بدل کر نئی نئی عورتوں سے شادی کرنا چاہے تو اس کے متعلق حکم ہے کہ ایک کو طلاق دے کر اس کی جگہ دوسری عورت کو لے آؤ لیکن اس آیت کو جب فواحدۃ والی آیت کی روشنی میں پڑھا جائے تو اس سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ عام حالات میں ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری کی اجازت نہیں۔ پہلی بیوی کے (قرآنی شرائط وحدود کے مطابق) طلاق پا لینے کی صورت میں اس کی جگہ دوسری بیوی کی اجازت ہوگی۔

شرعی سزائیں ایک صاحب تحریر فرماتے ہیں "طلوع اسلام" بابت اکتوبر ۸۹ء میں آپ نے لکھا ہے کہ قرآن نے جو سزائیں بتائی ہیں وہ زیادہ سے زیادہ سزائیں ہیں۔ حدود شرعی نافذ کرنے والے، احوال وظروف اور جرم کی نوعیت کے پیش نظر ان سے کم سزا بھی دے سکیں گے۔ کیا یہ آپ ہی کا اجتہاد ہے یا اس سے پہلے کہیں اس کی مثال بھی ملتی ہے؟

محترم پرویز صاحب نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرمایا:۔

جی نہیں یہ ہمارا ہی اجتہاد نہیں، تاریخ میں اس کی مثالیں ملتی ہیں مثلاً چوری کی سزا قطع ید ہے۔ یہ زیادہ سے زیادہ سزا ہے جو قرآن نے متعین کی ہے۔ کس قدر چوری اور کن حالات میں چوری کے جرم میں مجرم اس سزا کا مستحق ہوگا اور کن حالات میں اس سے کم سزا کا سزاوار، اس کے متعلق فقہ اور روایات میں تفصیلی مباحث موجود ہیں۔ روایات (مسلم اور بخاری) میں ہے کہ چوتھائی دینار کی چوری سے کم کی چوری میں چور کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ فقہ میں اس کو نصاب کہتے ہیں۔ بعض کے نزدیک نصاب ایک دینار ہے اور بعض کے نزدیک ربع (چوتھائی) دینار۔ یہ تو رہا مقدار کا سوال۔ اب لیجئے احوال وظروف کو۔ فقہ کی رو سے چور کو اس وقت تک قطع ید کی سزا نہیں دی جائے گی جب تک اس نے مال کسی محفوظ جگہ سے نہ چرایا ہو۔ نسائی کی ایک روایت میں ہے کہ حضرتؐ سے دریافت کیا گیا کہ جو جانور پہاڑوں پہ چرتے پھرتے ہیں ان کی چوری کی بابت کیا حکم ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص ایسا جانور چرا لے تو وہ جانور اور اس جانور جیسا ایک اور جانور پیش کرے اور اسے کوڑوں کی سزا دی جائے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جو شخص بھوکا ہو وہ اگر اپنی ضرورت کے مطابق کسی درخت سے پھل توڑ کر کھا لے (البشرطیکہ ساتھ باندھ کر نہ لے جائے) تو اس پر کچھ مواخذہ نہیں ہوگا۔ اور اگر کچھ ساتھ لے جائے تو اس کا دگنا معاوضہ اور کوڑوں کی سزا ہوگی۔ اسی بناء پر حضرت عمرؓ نے زمانۂ قحط میں روٹی چرا کر کھانے والے کو سارق نہیں ٹھہرایا تھا۔ امام ابن حزم ایسے مواقع کے متعلق تو یہاں تک کہتے ہیں کہ جب غرباء پر ایسا وقت آجائے اور دولتمند اس اضطرار کا احساس نہ کریں تو بھوکے غریبوں کو اجازت ہے کہ ان لوگوں کو لوٹ کر اپنی خوراک حاصل کرلیں۔

اگر اس کشمکش میں غریب مارا جائے تو اس کے قاتل پر اس کا خون بہا ہوگا اور اگر امیر آدمی مارا جائے تو امیر پر خدا کی لعنت ہوگی۔ غریب قاتل پر کچھ مواخذہ نہیں ہوگا۔

"مال محفوظ" کی شرط کے متعلق ایک لطیفہ بھی سنیئے۔ جب فقہ کا قانون بنا تو (جن دلوں سے تقویٰ اٹھ چکا تھا انہوں نے) اس قانون سے بچ نکلنے کے حیلے بھی وضع کرنے شروع کر دیئے اسے کتاب الحیل کہتے ہیں۔ وہی قانونی موشگافیاں اور لفظی فریب کاریاں جو بالعموم وکلاء کی روٹی کا ذریعہ بنتی ہیں۔

کتاب الحیل میں ہے کہ ایک شخص اور اس کا بیٹا چوری کرنے گئے انہوں نے نقب لگائی اور مال چرایا۔ اس کے بعد گرفتار ہو گئے اور سرقہ کا جرم ثابت ہوگیا۔ اب وہ حیلہ سنیئے جس سے قطع ید کی سزا سے بچنے کی تدبیر نکالی گئی۔ باپ نے کہا کہ میں نے مکان میں نقب لگائی تھی مال نہیں اٹھایا تھا۔ لہٰذا میں سارق نہیں ہوں۔ بیٹے نے کہا کہ مال بیشک میں نے اٹھایا تھا، لیکن ایسے مکان سے اٹھایا تھا جس میں نقب لگی ہوئی تھی اس لئے وہ مال، مالِ محفوظ نہیں تھا اس لئے میں بھی سارق نہیں ہوں۔ "قانون" کی رو سے دونوں کا دعویٰ درست تھا اس لئے سرقہ کی حد کسی پر بھی عائد نہیں کی جا سکتی تھی۔

غور کیجئے، ملوکیت کی لعنتیں کس انداز سے رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہیں۔ جب اسلامی نظام کا مقصد "انسان سازی" تھا تو اس وقت کیفیت یہ تھی کہ ایک عورت سے، بستی سے دُور خلوت میں، ایک فاحش جرم صادر ہوگیا۔ وہ خود عدالت میں آگئی اور اصرار کیا کہ اسے شریعت کے مطابق سزا دی جائے تاکہ وہ خدا کے سامنے شرمندہ نہ ہو۔ اور ایک یہ زمانہ تھا (کہ قانون بھی وہی تھا اور ماننے والوں کے ایمان کے الفاظ بھی وہی۔ لیکن روح بدل چکی تھی اس لئے) جرم ثابت ہو چکنے کے بعد، ایسے حیلے وضع کئے جاتے تھے جن سے قانون کی گرفت سے نکلا جا سکے۔

اسی سائل نے ایک اور سوال بھی تحریر کیا کہ

کوڑوں کی سزا

(۲) زانی کی سزا سو کوڑے لکھی ہے۔ کیا کوئی شخص سو کوڑے کھا کر زندہ بچ سکتا ہے! اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زانی کی سزا موت ہے اور موت کا طریقہ کوڑے مارنا ہے۔ اس لئے اس کی سزا اگر سنگساری کر دی گئی تو اس میں کیا حرج تھا!

اس سوال کے جواب میں محترم پرویز صاحب نے تحریر فرمایا:۔

آپ کا دوسرا سوال کوڑوں کے متعلق ہے۔ کوڑے اس قسم کے نہیں ہوتے تھے کہ سو کوڑوں سے انسان کی موت واقع ہو جائے۔ تاریخ میں ہمیں یہ واقعہ ملتا ہے کہ عہدِ حضرت عمرؓ میں ایک شخص نے دھوکے سے بیت المال سے کچھ روپیہ وصول کر لیا۔ حضرت عمرؓ

نے اس کو سو کوڑے پٹوائے، پھر دوسرے دن مزید سو کوڑوں کی سزا دی، پھر تیسرے دن سو کوڑے اور لگوائے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کوڑے ایسی چیز نہ تھے کہ جن سے موت واقع ہو جائے

زنا کی سزا سنگساری باقی رہا یہ کہ زنا سنگساری (رجم) میں کیا حرج ہے، سو ہر حرج یہ ہے کہ جب خدا نے حکم دے دیا کہ اس کی سزا سو کوڑے ہے تو کس کی مجال ہے کہ اس حکم کو کسی دوسرے حکم سے بدل دے!

دسمبر ۱۹۴۹ء ماہ دسمبر ۱۹۴۹ء کے رسالہ طلوع اسلام کے صفحہ اوّل پر تحریر ہے:۔

پارٹیاں کراچی میں چھوٹے اور بڑے سینکڑوں ہوٹل ہیں۔ ان میں اعلیٰ درجے کے ہوٹل بھی درجن بھر سے کم نہ ہوں گے۔ آپ کسی شام، کسی ہوٹل میں چلے جایئے، کسی نہ کسی کو پارٹی دی جا رہی ہوگی۔ ظہرانہ، عصرانہ، عشائیہ، رقص و سرود اس کے علاوہ۔

یہ پارٹیاں بالعموم لیڈروں یا بننے والے لیڈروں کے اعزاز میں، متوقع مفاد کے حصول کیلئے تقریب کا کام دیتی ہیں۔ بعض لیڈر ایسے بھی ہیں جن کے اعزاز میں ہفتوں تک پارٹیوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ایک ایک پارٹی میں پانچ پانچ سو مہمان۔ ہوٹل والے دس پندرہ روپے فی کس کے حساب سے وصول کرتے ہیں۔ اس کے بدل میں وہاں سے جو کچھ ملتا ہے، اس میں پچاس فیصدی چمک دمک، چالیس فیصدی بیماری اور دس فیصدی غذا ہوتی ہے۔ یہ اس قوم کے مشغلے ہیں جس کے کروڑوں نفوس ایسے ہیں جنہیں دو وقت کی روٹی نصیب نہیں ہوتی جس کی آبادی کا بیشتر حصہ منجمد کر دینے والے جاڑوں میں سڑکوں پر سوتا ہے، جن کے لاکھوں گھرانے درندوں کے قبضے میں ہیں جن کے یتیموں کا کوئی وارث نہیں جن کی بیواؤں کا کوئی پرسانِ حال نہیں، جن کے بیماروں کو دوا میسّر نہیں، جن کے مردوں کو کفن تک نصیب نہیں۔ یہ جگمگ جگمگ کرتے والی پارٹیاں اسی قوم کے غم میں گھلنے والے لیڈروں کو دی جاتی ہیں۔ نہ پارٹیاں دینے والوں کو شرم آتی ہے، نہ انہیں قبول کرنے والوں کو حیا۔ یہ انسانی نظام کی وہ ناہمواریاں ہیں جنہیں قرآن فساد فی الارض کہہ کر پکارتا ہے اور جس کا فطری اور لازمی نتیجہ، بربادی اور تباہی قرار دیتا ہے ؎

حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

قسم ہے بغداد اور رومتہ الکبریٰ کے کھنڈرات کی! یہ کچھ قوموں اور سلطنتوں کے مٹنے کے زمانہ میں ہوا کرتا ہے، ابھرنے کے وقت نہیں۔

لمعات اس ماہ کے لمعات میں قوم مسلم کی جذبات پرستی اور پارٹی بازی کے تباہ کن عواقب کی نشاندہی کرتے ہوئے محترم پرویز صاحب نے لکھا:۔

ہماری ناکامیوں اور تباہ حالیوں کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم بڑے جذباتی ہو چکے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم حقائق کا سامنا کرنے سے گھبراتے ہیں اور کوئی ایسا کام جس میں جذباتی طلاطم

خیزیاں اور شور انگیزیاں نہ ہوں۔ ہماری فطرتِ سیماب آسا کو مطمئن نہیں کر سکتا۔ ہم ایک مدت کی جذبات پرستی سے اس کے خوگر ہو چکے ہیں کہ ایک رقص ہو، ایک ہنگامہ ہو، ایک جوش ہو، ایک خروش ہو۔ لچھے دار تقریریں ہوں، فلک بوس نعرے ہوں۔ سیل انگیز جلوس ہوں، زلزلہ خیز ریزولیشن ہوں، بڑی بڑی انقلاب در آغوش سکیمیں بنائی جائیں، آسمان الٹ دینے والے منشور (MANIFESTO) شائع کئے جائیں، تہلکہ مچا دینے والے عزائم و مقاصد کا اعلان کیا جائے، اور اگر اس سے بھی کام نہ چلے تو فریقِ مقابل کو گالیاں دیکر جیل خانہ ہو آئیں۔ بس اس کے بعد آپ کے باعمل ہونے میں کوئی کسر باقی نہیں۔ یہی معراجِ مقاصد ہے، یہی منتہائے جہاد ہے اور یہ سب کچھ ایک پارٹی بنا کر کیا جائے۔ جماعت سازی اور گروہ بندی کے بغیر آپ باعمل ہونے کا کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکتے۔ زندگی کی مقیاس ہی پارٹی بازی ہے۔

یہ ہے "عمل" کا وہ تصور جو ایک عرصہ سے قوم کے ذہن میں مرتسم کیا جا رہا ہے اور جس کے ذریعے قوم کے جذبات سے بُری طرح کھیلا جا رہا ہے۔ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیئے کہ آپ کی گذشتہ تاریخ سیاست میں کیسے کیسے دلفریب نعرے (SLOGANS) تھے جن سے قوم کے جذبات کو مشتعل کر کے اسے آگ کے شعلوں میں جھونک اور خون کی ندیوں میں دھکیل دیا گیا۔ ذرا غور کیجئے کہ اس دوران میں آپ کی قوم نے کس قدر جانی اور مالی قربانیاں دیں اور وہ تمام قربانیاں کس بُری طرح سے رائیگاں گئیں۔ کتنے افراد ہیں جو ان بے نتیجہ قربانیوں کے ہاتھوں دربدر مارے مارے پھر رہے ہیں۔ کتنے خاندان ہیں جو ان جذباتی شعلہ فشانیوں کے بے معنی ہنگاموں سے تباہ و برباد ہو چکے ہیں۔ کتنے بچے ہیں جن کی نگہ پرداخت کرنے والے ان طلاطم انگیز بے مقصد تحریکوں کی بھینٹ چڑھا دیئے گئے اور آج ان کا کوئی والی اور وارث نہیں۔ کتنی بیوائیں ہیں جو آج انہی ہنگاموں کے صدقے اپنی چاک دامانی سے قوم کی غیرت و حمیت کا ماتم کر رہی ہیں۔ کتنے باپ ہیں جن کی زندگی کے سہارے یہی سیلاب انگیزیاں بہا کر، اور کتنی مائیں ہیں جن کی آنکھوں کا نور یہی برق سامانیاں اچک کر لے گئیں۔ کتنے گھر ہیں جن کے چراغ انہی جھکڑوں نے بجھا دیئے اور کتنے در ہیں جنہیں یہی آندھیاں اکھیڑ کر لے گئیں۔ اور ان تمام بربادیوں اور تباہیوں کا ماحصل؟ فضا میں چند الفاظ سے پیدا کردہ وقتی ارتعاش اور سینوں میں چند نعروں سے ابھارا ہوا عارضی تموج۔ سوچئے کہ آپ کی بے شمار تحریکوں اور لاتعداد جماعتوں کے "جہاد زندگی" کا مابقا اس کے سوا کچھ اور بھی ہے؟ یہ تو یوں کہئے کہ قدرت کو ان چند کروڑ مسلمانوں کو بچانا مقصود تھا جو بساطِ سیاست کی آخری مہرہ بازی۔ جناح جیسے ٹھنڈے دماغ کے ہاتھ لگ گئی جس نے اس مردِ آخر بین کے فکرِ صحیح کو یوں متشکل کر دکھایا جس کی مغفرت کے لئے عالمگیر کی مسجد جامع کے مینارے شب و روز دستِ بدعا ہیں۔ ورنہ ہماری ہنگامہ خیز محفلوں کی یا دگار آج سوائے خاکستر پروانہ کے اور کچھ بھی نہ ہوتی۔

طلوعِ اسلام کو فطرت کی گرم گستری نے یہ سمجھنے کی توفیق ارزانی فرمادی کہ قوموں کے حالات

ہنگامہ خیزیوں اور تموج انگیزیوں سے نہیں بدلا کرتے۔ ان کی حالت میں کوئی تبدیلی مستقل طور پر پیدا نہیں ہو سکتی جب تک ان کے قلب و نگاہ میں تبدیلی نہ پیدا ہو، خارجی دنیا میں کوئی انقلاب رونما نہیں ہو سکتا جب تک انسان کی داخلی دنیا میں انقلاب واقع نہ ہو جائے کسی قوم کا معاشرتی نظام صحیح خطوط پر متشکل نہیں ہو سکتا جب تک اس میں تطہیر فکر و نظر نہ ہو جائے۔ انسان ویسا ہی کرتا ہے جیسا سوچتا ہے۔ لہٰذا جب تک اس کی سوچ کی بنیادیں صحیح نہ ہوں اس کا کردار صحیح قالب میں نہیں ڈھل سکتا۔ اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی اس کے سامنے بے نقاب ہو گئی کہ فکر و نظر میں تبدیلی پیدا کرنے کی راہ بڑی صبر آزما اور ہمت شکن ہے۔ اس لئے کہ اس راہ میں بڑی آہستہ خرامی اور نرم روی کی ضرورت ہے۔ اس میں سطح کی تلاطم انگیزیاں نہیں بلکہ عمیق دریا کی غیر محسوس روانیاں ہیں۔ پھر اس راہ میں سب سے بڑی دشواری یہ ہوتی ہے کہ جذبات پرست قوم پیش پا افتادہ مفاد کی طرف لپکنے کی خو گر ہوتی ہے اور قلب و نظر میں تبدیلی کے آثار کہیں ایک دو نسلوں کے بعد جا کر سامنے آیا کرتے ہیں۔ یعنی غالب کے الفاظ میں، عجلت پسند قوم کی تمنائے حصول مقاصد بے تاب اور دل کی دنیا کا عشق آسا انقلاب، صبر طلب ہوتا ہے اس لئے ہنگاموں کی عادی قوم فکر و نظر کی تبدیلی کی جدوجہد کو عمل میں شمار ہی نہیں کرتی۔

عبادت

اس ماہ محترم پرویز صاحب کا ایک اہم مضمون "عبادت" طلوع اسلام کے اوراق کی زینت بنا ہے جس میں عبادت کے تحت نہایت اہم مباحث پر نئے انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ قانون کیا ہے؟ خدا اور بندے کی رفاقت کا کیا مفہوم ہے؟ فطرت اللہ سے کیا مراد ہے؟ صبغۃ اللہ کسے کہتے ہیں۔ اس مضمون میں چند اقتباسات تشنگان علم دین کی سیرابی کے لئے پیش خدمت ہیں۔

★ اسلام، دھرم (باصطلاح عوام مذہب) نہیں اس لئے مختلف دھرموں سے اسکا تقابل و توازن کیا؟ یہ ایک نظام زندگی ہے۔ یا سمجھنے کے لئے یوں کہئے کہ نظام حکومت ہے اس لئے اس کا مقابلہ کیا جائے گا۔ ان نظامہائے حکومت سے جو ذہن انسانی نے آج تک وضع کئے ہیں اور یوں بتایا جائے گا کہ نظام آسمانی۔ زمین کے نظامہائے حکومت سے کس طرح فائق اور برتر ہے۔

★ دھرم سے مفہوم یہ ہے کہ انسان پرستش، یعنی پوجا پاٹ، کیلئے کسی شے (OBJECT) کو تجویز کرتا ہے۔ اس کے سامنے ماتھا ٹیکتا ہے، پرستش کی رسوم وضع کرتا ہے یہ پرستش کی شے کوئی پتھر ہو یا مظاہر فطرت میں سے کوئی چیز۔ اجرام سماوی ہوں یا کوئی دوسرا انسان۔ فرشتے ہوں یا خدا۔ کچھ بھی ہو اور کوئی بھی ہو۔ انسان اور اس کے درمیان تعلق صرف اتنا ہوتا ہے کہ وہ اس کے لئے پرستش کی چیز ہے۔ باقی رہی دنیا کے معاملات، تو اس کے لئے

اخلاقیات کی چند چیزیں جو عام طور پر ہر جگہ مشترک پائی جاتی ہیں۔ مثلاً جھوٹ نہ بولو، چوری نہ کرو، حرامکاری سے بچو، کسی کو دُکھ نہ دو وغیرہ یہ ہے خدا پرستی اور یہ ہے نیک عملی۔ اس کا نام ہے دھرم۔

★ اسلام میں خدا پوجا پاٹ کی شے (OBJECT OF WORSHIP) نہیں بلکہ حاکمِ اعلیٰ ہے۔ انسان اور خدا کے درمیان پرستار اور پرستیدہ کا تعلق نہیں۔ بلکہ حاکم اور محکوم کا تعلق ہے۔ دین کی دعوت خدا کی پرستش نہیں بلکہ خدا کی حاکمیت کا عملی اقرار ہے یہاں نیک عملی سے مقصود ایک ضابطۂ اخلاق کی پیروی نہیں جو ہر جگہ یکساں ہے۔ اسلام میں نیک عملی سے مراد اس ضابطۂ قوانین کی اطاعت ہے جو خدا کی حکومت کا دستورِ اساسی ہے۔ اسلام کا تقابل، ضوابطِ اخلاق سے نہیں بلکہ دنیا کے ضوابطِ قوانین و دساتیر سے ہوگا۔ نظامِ حکومت اور آئینِ سلطنت سے ہوگا۔ اس نظامِ حکومت (دین) اور دنیا کے دیگر نظامہائے حکومت میں بنیادی فرق یہ ہے کہ یہاں اصولاً قانون سازی کا اختیار کسی کو نہیں یہ حق صرف خدا کو حاصل ہے انسان اس قانون کو نافذ کرنے کے لئے ہیں۔

★ لفظ عبادت کے معنی محکومیت ہیں۔ پوجا اور پرستش نہیں۔ عبد کے معنی ہیں غلام، بندہ، محکوم حضرت موسیٰؑ (اور حضرت ہارونؑ) نے فرعون کو ایمان کی دعوت دی ہے تو اس نے اور اس کے اربابِ حل وعقد نے یہ کہہ کر اس دعوت کو مسترد کیا تھا۔ بلکہ اس کا استخفا کیا تھا کہ ہم اس قوم کے نمائندوں کی دعوت کو کیسے قبول کر لیں جو خود ہماری محکوم ہے۔

★ خدا کی اطاعت و محکومیت کے علاوہ کوئی بھی نظامِ اطاعت وحکومت ہو، سب غیر فطری اور غیر اسلامی ہیں۔ قرآن کی اصطلاح میں ایسے نظام کا نام طاغوتی نظام یعنی غیر اللہ کا نظام ہے، جو خدا کی حکومت سے سرکشی اختیار کر کے کوئی اور نظامِ اطاعت وحکومت قائم کرے وہی طاغوت ہے اس لئے حکومتِ خداوندی کا اقرار اور ہر طاغوتی نظامِ اطاعت کا انکار، دینِ فطرت ہے۔

★ قرآن کہتا ہے کہ یہ تمام نظامِ کائنات ایک خاص نظم وضبط سے چل رہا ہے اور ایک متعینہ منزل کی طرف رواں دواں چلے جا رہا ہے اس میں ہر آن، حق و باطل کی کشمکش جاری ہے، حق اور باطل، قرآن کی دو عظیم اصطلاحیں ہیں جن کا صحیح مفہوم تفصیلاً سمجھ میں آسکتا ہے۔ اجمالاً صرف اتنا سمجھئے کہ حق پروگرام کے مثبت (POSITIVE) پہلو کا نام ہوتا ہے جس کا نتیجہ تعمیر ہوتا ہے اور باطل اس کے منفی (NEGATIVE) پہلو کو کہتے ہیں جس کا مآل تخریب ہوتا ہے۔ ہر تعمیر کے لئے ایک تخریب ضروری ہوتی ہے جب تک دانہ میں منفیانہ حیثیت سے تخریب نہیں واقعہ ہو جاتی، پودا اپنی مثبت حیثیت سے وجود میں نہیں آسکتا۔ قرآن کہتا ہے کہ کائنات میں منفی اور مثبت پہلوؤں کی یہ کشمکش ہر آن جاری ہے لیکن قانون یہ ہے کہ مثبت پہلو

ہمیشہ غالب رہتا ہے۔ تعمیری پہلو کے اسی غلبہ سے کائنات میں ارتقاء (EVOLUTION) کا سلسلہ جاری ہے۔

ماہنامہ چراغِ راہ، کراچی کا قیادت نمبر ماہنامہ چراغِ راہ اسلامی جماعت کا نقیب ہے اس کے زیرِ نظر قیادت نمبر پر تبصرہ اور اسلامی جماعت کی مخالفت کی وجۂ جواز بیان کرتے ہوئے تحریر فرمایا۔

مسلم لیگی قیادت کے متعلق، تقسیم ہند سے پہلے اور تقسیم ہند کے بعد، اسلامی جماعت کا مسلک اور طرزِ عمل محتاجِ تعارف نہیں۔ زیرِ نظر قیادت نمبر اسی مسلک اور اسی قسم کی تنقید پر مشتمل ہے۔ اسلامی جماعت کے مؤقف، مسلک اور منہاج کے متعلق، طلوعِ اسلام میں اس سے قبل اکثر مرتبہ لکھا جا چکا ہے۔ اس لئے قارئین طلوعِ اسلام اس باب میں ہمارے نقطۂ نگاہ سے بھی واقف ہیں۔ لیکن ان تمام تصریحات کے باوجود، یہ سوال اکثر دہرایا جاتا ہے کہ جب طلوعِ اسلام بھی اسلامی نظام کا داعی اور مبلغ ہے۔ اس کی شروع سے یہی پکار چلی آتی ہے کہ ہر وہ نظامِ معاشرت وحکومت جو غیر قرآنی خطوط پر متشکل ہے، طاغوتی نظام ہے اور اسی بنا پر وہ مسلمانوں کی موجودہ قیادت پر کبھی مطمئن نہیں ہوتا اور ان کے ہر مذموم فیصلہ پر کڑی تنقید کرتا ہے۔ اور یہی کچھ اسلامی جماعت کا مسلک وعمل ہے تو پھر طلوعِ اسلام، اسلامی جماعت کا ہم مسلک وہم نوا کیوں نہیں بنتا؟ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے اس سوال کا جواب اس سے پیشتر کئی مرتبہ دیا جا چکا ہے لیکن چونکہ اس سوال کو بار بار ہمارے سامنے لایا جاتا ہے۔ اس لئے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ قیادت نمبر پر تبصرہ کے ضمن میں، اس موضوع پر ایک بار پھر مختصر انداز سے گفتگو کی جائے۔

طلوعِ اسلام کی اسلامی نظام کی طرف دعوت کسی تشریح وتبصرہ کی محتاج نہیں۔ اس کا وجود ہی اس مقصدِ عظیم کے لئے عمل میں آیا ہے۔ باقی رہی موجودہ قیادت پر اس کی تنقید، سو اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ چراغِ راہ کے زیرِ نظر "قیادت نمبر" میں، خود طلوعِ اسلام کا ایک پورا مضمون بہ تبدیلی عنوان شامل ہے لیکن اس کے باوجود طلوعِ اسلام کو اسلامی جماعت سے اختلاف ہے یقیناً یہ امر موجبِ حیرت واستعجاب ہے، اور اس لئے اس کی ضرورت ہے کہ اس وجۂ اختلاف کو ایک مرتبہ پھر واضح کر دیا جائے۔

ہمارے نزدیک مسلمانوں کی قوم یکسر جذباتی قوم بن چکی ہے۔ اسی کو ہم دوسرے الفاظ میں شاعروں کی قوم، کہا کرتے ہیں۔ یہ پوری کی پوری قوم شاعروں کی قوم ہے اور زندگی کے ہر شعبے میں شاعری کرتی ہے۔ شاعری سے مراد یہ نہیں کہ یہ شعر کہتی ہے اور نظمیں لکھتی ہے۔ بلکہ یہ زندگی کے محسوس حقائق کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی بجائے، یہ قوم جذبات کی دنیا میں مست ہے۔ اس میں سنجیدہ فکر اور متین تدبّر کی صلاحیت نہیں رہی۔ اس کا دماغ، مجلہ حیات کا "افسانہ نمبر" بن چکا ہے۔ انہیں اس سے غرض نہیں کہ واقعات کی دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ زندگی کے تقاضے کیا کہہ رہے ہیں،

یا کی قومیں کہاں سے کہاں پہنچ رہی ہیں، ان میں ہمارا مقام کیا ہے؟ اور ہم اس مقام پر کیوں ہیں؟ انہیں ان سوالات سے کچھ غرض نہیں۔ انہیں زندگی کے ان تقاضوں اور وقت کے ان مطالبوں سے کچھ واسطہ نہیں۔ یہ حالت ہمیشہ اس قوم کی ہوتی ہے جن میں قوتِ عمل مفقود ہو چکی ہو۔ جن کے قوائے عملیہ مفلوج و مشلول ہوں۔ زندگی کے ٹھوس حقائق عمل کے متقاضی ہوتے ہیں۔ عمل سے عاری قومیں اپنے آپ کو جذبات کی افیون سے فریب دے لیتی ہیں۔ اس افیونی فریب میں مذہب کا غلط تصور، جزوِ اعظم کی حیثیت رکھتا ہے۔

جذبات کی افیون خوردہ قوم کو اپنے پیچھے لگا لینا بڑا آسان ہوتا ہے۔ حقائق کی دنیا میں رہنے والی قوم، ہر پکارنے والے کی پکار کو تاریخ سے پرکھتی ہے۔ وہ صرف اسی کی سنتی ہے جس کی آواز کوئی ٹھوس نتیجہ سامنے لے آئے۔ وہ اسی کے پیچھے چلتی ہے جو ان کی مشکلات کا عملی حل ان کے سامنے رکھ دے۔ اس کے برعکس جذبات زدہ قوم کو اپنے پیچھے لگا لینے کے لئے، چند ولولہ انگیز نعروں، چند حسین ترکیبوں، چند نگاہ فریب نظریوں اور چند خوش آئند وعدوں کے سوا کسی اور چیز کی ضرورت نہیں ہوتی اور چونکہ، جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے اس فریب خوردنی میں مذہب کے غلط تصور کو سب سے بڑا دخل ہوتا ہے، اس لئے ان خوش آئند نظریوں اور نگاہ فریب وعدوں کو اگر مذہب کے رنگ میں رنگ دیا جائے تو اس طلسم ہوش ربا کی کامیابی میں کوئی شبہ ہی نہیں رہتا۔ یہی وہ آسان راستے ہیں جن سے ہر رہزن سبک پا آتا ہے اور انکی متاعِ دین و دانش کو نہایت اطمینان سے لوٹ کر لے جاتا ہے اور انہیں خبر بھی نہیں ہونے پاتی کہ ان کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ نہیں اتنا ہی نہیں کہ انہیں خبر نہیں ہونے پاتی، بلکہ یہ افیون ان کی نگاہ کے زاویوں کو اس طرح بدل دیتی ہے کہ یہ رہزن کو مشفق اور قزاق کو سب سے زیادہ ہمدرد سمجھتی ہے ان رہزنوں کے علاوہ جو دیدہ دانستہ، ان کے متاعِ ملی کو غصب کرتے ہیں، ایک طبقہ نادان دوستوں کا بھی ہوتا ہے، جو ان کی جذباتی افیون کو تیز سے تیز کرتا رہتا ہے اور انہیں کبھی ہوش میں نہیں آنے دیتا۔

یوں تو ساری دنیا کے مسلمانوں کے ساتھ یہی کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے، لیکن سرِ دست ہمارے پیشِ نظر صرف ہندوستان (اور اب پاکستان) کے مسلمان ہیں۔ ان کی گذشتہ ایک سو سال کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے اور سوچئے کہ ان دانا دشمنوں اور نادان دوستوں نے، جن کی طرف اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے۔ کس بری طرح ان کے جذبات کو لوٹا اور کھسوٹا ہے۔ سوچئے کہ ان کے سفرِ حیات میں کتنے ایسے مقام آئے ہیں جہاں چند نعروں سے مدہوش کر کے، پوری کی پوری قوم کو تباہ کر دیا گیا۔ سوچئے کہ ان کی سو سال کی مختلف تحریکوں کا ماحصل کیا رہا ہے؟ یہ سیماب پا قوم چند گرم گرم نعروں کی حرارت سے کس طرح بگولے کی طرح اٹھتی رہی ہے اور اس کے بعد، کس بری طرح آنسوؤں کی طرح بیٹھ جاتی رہی ہے۔ غور کیجئے کہ اس کے اس قسم کے جوش و خروش کا ردِ عمل کیا ہوتا رہا ہے۔ ان ہنگامہ خیزیوں اور غوغا آرائیوں کو بھی چھوڑ دیئے اور اسے دیکھئے کہ مذہب کے غلط تصور نے ان کی زندگی کے

تمام حرکات و سکنات کو کس درجہ بے نتیجہ بنا رکھا ہے۔ تفصیل کی ضرورت نہیں۔ خود ہی سوچئے کہ مذہب کے غلط تصور کے جس فریب میں قوم کو مبتلا رکھا جا رہا ہے، اسے ان کی تباہی اور بربادی میں کتنا بڑا دخل ہے۔

یہ ہے مسلمانوں کی وہ جذبات زدہ قوم، جسے ہر شخص جو چند فقرے لکھنا یا چند الفاظ بولنا جانتا ہو، نہایت آسانی سے اپنے پیچھے لگا لیتا ہے۔ نہیں! بلکہ اکثر اوقات ان متبوعین کے لئے یہ بھی ضروری نہیں ہوتا کہ وہ لکھنا اور بولنا بھی جانتے ہوں۔ اس بھولے شکار کے لئے تو نراشی خراشی کے مخصوص انداز اور وضع قطع کے خاص اسلوب کا جال اور دانہ ہی کافی ہے۔ یاد رکھئیے! اس قسم کا سچا بہی خواہ وہ ہو سکتا ہے جو اسے جذبات کی دنیا سے نکال کر، دو اور دو چار کہنا اور سمجھنا سکھائے اور الفاظ کا مفہوم نتائج سے پرکھنا سکھائے۔ ہمیں اس کا خوب احساس ہے کہ جذبات کے بعد یہ دنیا مشین رہ جاتی ہے۔ اور عمل، جذباتِ صحیحہ ہی سے پیدا ہوتا ہے لیکن جذبات کی جس افراط میں ہماری قوم مبتلا ہے اس کا علاج یہی ہے کہ ان سے یہ ایفون کسی طرح چھڑا دی جائے۔ سرسام کا علاج، سر پر برف رکھنا ہوتا ہے۔ جب درجۂ حرارت اعتدال پر آجائے، پھر آپ گرم اور سرد دونوں قسم کی فضاؤں میں رہ سکتے ہیں اس وقت قوم سرسام زدہ ہو رہی ہے۔ اسے جذبات سے الگ کر کے حقائق کا سامنا کرنے کا خوگر بنانا ازبس ضروری ہے۔ اس سو سال کے عرصہ میں ایسے دیدہ ور بھی گذرے ہیں جنہوں نے قوم کے اس مرض کا صحیح اندازہ کیا اور انہیں حقائق سے دوچار ہونے کی دعوت دی۔ ہماری گردن تشکر ان کے اس احسان کے احساس سے خمیدہ ہے۔ ہمیں اس وقت ان تمام صاحبانِ فکر و عمل کا تذکرہ مقصود نہیں صرف اس آخری چارہ گر کی طرف اشارہ منظور ہے جس کی نگہ دوررس اور حقائق پروری کی وجہ سے ہم آج اس قابل ہیں کہ ایک خطۂ زمین پر خدا کے احکام نافذ کر سکنے کا امکان پاتے ہیں۔ غور کیجئے ۱۹۲۰ء سے آگے چل کر مسلمانوں کی سیاست کس طرح جذبات کی تلاطم انگیزیوں میں بہی چل رہی تھی اور ہندو ان کی اس مدہوشی سے کس طرح فائدہ اٹھا رہا تھا۔ یہ قوم کی خوش بختی تھی کہ عین اس وقت فکرِ اقبالؒ کی شمع قائداعظمؒ (مرحوم و مغفور) جیسے نبرد آزما ہاتھوں میں آگئی۔ جذبات کی شرر انگیزیاں ان کی فطرت کے خلاف تھیں۔ وہ حقائق کا سامنا، جذبات سے یکسر الگ ہو کر کیا کرتے تھے اور ان کی دہ سالہ بساطِ سیاست پر غور کیجئے۔ اس میں ایسے ایسے مقام آئے کہ ان کی جگہ کوئی بھی اور ہوتا تو یقیناً جذبات کی سیلِ بے پناہ میں بہہ جاتا۔ ہندو یہی چاہتا تھا لیکن یہ ہماری خوش بختی تھی کہ فطرت نے انہیں مزاج ہی ایسا دیا تھا کہ ان کی فکر کبھی جذبات سے مغلوب نہیں ہوتی تھی وہ مسلمانوں جیسی سراپا اشتعال قوم کو جذبات کی شعلہ فشانیوں سے نکال کر حقائق کی دنیا میں لے آئے۔ یہی ان کا وہ کمالِ سیاست تھا جس کے سامنے ہندو کو قدم قدم پر زک اٹھانی پڑی۔　　(جاری ہے)

وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ

ہمارے ہاں خاص وعام میں یہ عقیدہ بڑی پختگی سے رائج ہے کہ "اللہ جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے"۔ اس عقیدے کے ساتھ سب اس قسم کی باتیں کرتے رہتے ہیں کہ یہ تو اللہ کی شان ہے۔ جسے چاہا شاہی بخش دی جسے چاہا گدا بنا دیا۔ اس کے بندوں کی کیا مجال ہے کہ اس کی بارگاہ میں دم مار سکیں۔ آپ دیکھتے نہیں کہ کل تک فلاں کے پاس دولت کی کتنی ریل پیل تھی۔ آج وہ مفلسی اور قلاشی کی حالت میں ایک ایک کا منہ دیکھتا ہے۔ دوسری طرف اس مال دار کو دیکھئے، بھیک مانگتا پھرتا تھا۔ اب روپے پیسے میں کھیل رہا ہے۔ بس جی سب قدرت کے کھیل ہیں۔ بندے کے بس میں کیا ہے۔ ملے گا تو وہی جو قسمت میں لکھ دیا گیا ہے۔ جس کی قسمت میں امیر ہونا ہے وہی امیر و دولت مند بنتا ہے۔ جو غریب کے گھر میں پیدا ہوتا ہے، اس کے مقدر میں غربت لکھی ہے۔ کیا ہم اللہ کی مرضی کے خلاف شکوہ شکایت کر سکتے ہیں؟ کیا ہم اس کی رضا پہ ایمان نہیں رکھتے؟ توبہ توبہ! خدا ہمیں ایسے کفر سے بچائے رکھے، آمین۔

یہ ہے ہمارا عمومی فلسفۂ زندگی جس کے تحت معاشرہ کا ہر فرد اپنی اپنی زندگی گزارتا چلا جاتا ہے دولت کو عزت کا معیار سمجھ کر دولت مند یعنی عزت والے عزت سے ہمکنار زندگی بسر کرتے ہیں اور تہی دست ناقہ زدہ ذلت میں گرفتار جیتے چلے جاتے ہیں۔ اس عزت و ذلت کے لئے سند بنایا گیا ہے اس آیۃ قرآنی کو کہ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ۳/۲۵ جس کا ترجمہ یہ کیا گیا ہے "اور عزت دے جس کو چاہے اور ذلیل کرے جس کو چاہے"۔ یہاں غور کرنے اور سمجھنے کی بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں جن معنوں میں عزت اور ذلت کے الفاظ کا استعمال ہوتا ہے اور جو اس آیت کے ترجمے میں کیا گیا ہے۔ عربی زبان میں ان کے یہ معانی نہیں ہیں۔ بلکہ عربی میں عزت کا مطلب قوت، شدت اور غلبہ ہے اور ذلت کے معنی مغلوبیت، قوت کا ٹوٹ جانا اور کمزور ہو جانا ہیں۔ جن معنوں میں ہم عزت کا استعمال کرتے ہیں اس کے لئے عربی زبان اور قرآن کریم میں تکریم کا لفظ آتا ہے۔ اسی طرح ذلت کے لئے توہین کا۔ ہم نے دولت کو تکریم کا معیار بنا لیا جب کہ قرآن کریم کی رُو سے یہ ایک باطل تصور ہے۔ تکریم تو وہ شے ہے جسے خدائے بزرگ و برتر نے ہر انسانی بچے کو محض انسان ہونے کی وجہ سے اس کا مستحق ٹھہرایا ہے اور یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰) اور یہ بھی بتا دیا کہ معاشرے میں مدارج کا تعین ہر فرد کے اعمال اور حسنِ سیرت و کردار پہ ہونا چاہیئے۔ پھر سب سے زیادہ تکریم یا ہماری زبان میں عزت کا حقدار وہ ہوگا جو سب سے زیادہ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرے گا۔ اِنَّ

اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ (۴۹/۱۳) یعنی قرآن کے نزدیک صاحب عزت وہ ہوتا ہے جو بلند کردار کا حامل ہوتا ہے اور اس کے برعکس ذلت یا رسوائی ان کا مقدر بنتی ہے جو قوانین خداوندی سے انکار اور ان کی تکذیب کرتے ہیں۔ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَکَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا اُولٰٓئِکَ لَھُمْ عَذَابٌ مُّھِیْنٌ (۲۲/۵۷) اسی طرح سورہ حٰمٓ میں یہ حقیقت بطور اصول بیان کر دی کہ عَذَابَ الْھُوْنِ بِمَا کُنْتُمْ تَکْسِبُوْنَ (۴۱/۱۷) رسوا کن عذاب تمہارے اپنے ہی اعمال کی بدولت آتا ہے۔ یہ ہے وہ مستقل قانون عزت اور ذلت کا جو قانون والے خدا نے اپنے بندوں کو واضح طور پر سمجھا دیا۔ لیکن ہم ——— اپنی ہر ذمہ داری سے فرار کی راہیں تلاش کرنے کے عادی ہیں۔ ہم نے اس اہم ذمہ داری سے بچنے کے لئے بھی "خدا کی مرضی کی آڑ" ڈھونڈ لی اور یوں اپنی دانست میں خدا ہی کو اس کا ذمہ دار ٹھہرا کر یہ سمجھ لیا کہ اب ہم سے کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔ جب خدا جس کو چاہے گا عزت یا ذلت دے گا تو پھر ہماری ذمہ داری کیسی؟ ہم بُرا کریں یا بھلا، خدا کے چاہنے کے سامنے اسکی حقیقت کیا ہے!!

ایسے ہی مفروضات کے سہارے دولت و قوت کے بل بوتے پر معاشرے میں معزز و محترم بن بیٹھنا ہمارے ہاں ان لوگوں کا دستورِ حیات ہے جنہوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ زندگی کا مقصود مال و دولت کا حصول ہے۔ خواہ وہ جائز طریق سے ہو خواہ اسے ناجائز ذرائع سے سمیٹا جائے۔ ظاہر ہے ایسے صاحبانِ حیثیت اور غلبہ اقتدار رکھنے والوں کے سامنے زیر دستوں اور ذلت والوں کو جھکنا ہی پڑتا ہے کہ جب تک یہ لوگ اپنا سر نیچا نہیں کریں گے ان کا اونچا ہوا سر دوسروں کو کیونکر نظر آئے گا! عزت و ذلت کا یہ وہ "انسانی" معیار ہے جو تعلیم قرآنی سے قطعاً کوئی مطابقت نہیں رکھتا لیکن اس ستم کی چارہ گری کیا ہو کہ جانتے بوجھتے ہوئے قرآن پر ایمان اور اس کے اصول و اقدار کی پہچان رکھتے ہوئے ہمارا ہر قدم تعلیم قرآنی کی حدود سے سوا اٹھتا ہے۔ قرآن تو ہمیں قدم قدم پر یہ وعید دیتا ہے کہ غلط معیارِ فضیلت کی بناء پر حاصل کردہ اعزاز و احترام کا انجام بالآخر ذلت آمیز تباہی ہوتا ہے جو اس دنیا میں بھی سامنے آجاتا ہے اور یہ کہ جھوٹے اقتدار اور مصنوعی عزتوں کے دعویدار دنیا و آخرت دونوں میں رسوائی سے دوچار ہوں گے۔ ایسی عزت کو سورہ البقرہ میں عِزَّۃٌ بِالْاِثْمِ کہا گیا ہے یعنی وہ غلبہ و اقتدار جس سے بظاہر بڑی قوت حاصل ہوتی معلوم ہو۔ لیکن درحقیقت وہ اثم یعنی اضمحلال کی طرف لئے جا رہا ہو۔ اور جو عزت و اقتدار حق سے وابستہ نہیں ہوتا اس کا نتیجہ عَذَابَ الْھُوْنِ ہوتا ہے۔ زیر نظر آیت کے صحیح مفہوم سے آگاہ ہونے کے لئے ضروری ہے کہ عزت و ذلت کے قرآنی معانی کو سامنے رکھا جائے تاکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو عزت و ذلت کا جو قانون دیا ہے وہ سمجھ میں آسکے۔ عزت کا مطلب قوت و عظمت اور ذلت کا مطلب کمزوری و مغلوبیت جان لینے کے بعد عزت کے تعلق سے ہمارے سامنے سورہ فاطر کی وہ آیہ جلیلہ

آتی ہے جو اس کا ایک جامع اصول عطا کرتی ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے۔ مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعِزَّةَ فَلِلَّهِ الْعِزَّةُ جَمِيعًا (۳۵/۱۰) جو تم میں سے قوت و عظمت (عزت) حاصل کرنا چاہے تو اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ صحیح عزت اللہ کے ہاں سے (یعنی قوانین خداوندی کی پابندی سے) حاصل ہو سکتی ہے۔ یہاں غور طلب بات یہ ہے کہ مَنْ كَانَ يُرِيدُ الْعِزَّةَ یعنی تم میں سے جو کوئی عزت حاصل کرنا چاہے (بلند مرتبہ ہونا چاہیئے) اس فرمانِ ربّی سے اس حقیقت کی وضاحت ہوتی ہے کہ عزت اُسے ہی ملتی ہے جو خود اس کا طالب ہوتا ہے اور اس کے حصول کے لئے قانونِ خداوندی کے مطابق کوشش کرتا ہے یعنی خدا یونہی کسی کو عزت بخش نہیں دیتا۔ نہ ہی کسی کو خواہ مخواہ ذلیل کرتا ہے۔ انسان کے اپنے اعمال اس کی عزت یا ذلت کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ عزت، ایمان اور اعمالِ صالحہ کے نتیجے میں حاصل ہوتی ہے جب کہ ذلت بداعمالیوں میں پرورش پاتی ہے۔ صحیح نظریۂ حیات یعنی اللہ کی آخری کتاب قرآن حکیم کے عطا کردہ قواعد و ضوابط کی صداقت پر یقین رکھنے کا نام ایمان ہے۔ یہ قرآنی نظریہ بلندیوں کی طرف لے جانے کی صلاحیت رکھتا ہے اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ یعنی صحیح نظریہ حیات جس میں بارآوری کی صلاحیت ہو اور اعمالِ صالحہ اسے اوپر کی طرف لے جانے کا ذریعہ بنتے ہیں وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ (۳۵/۱۰) خدا کا قانون مشیت یہ ہے کہ ہر ایک کو اس کی سعی و عمل کا پھل ملتا ہے۔ لَيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ (۵۳/۳۹) یعنی انسان کو وہی نتائج مل سکیں گے جس کے لئے اس نے محنت اور کوشش کی ہوگی۔ یہ وہ اٹل اصول اور دائمی فیصلے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں تمام نوعِ انسان کے لئے قیامت تک کے لئے کر دیئے ہیں۔ چنانچہ عزت و ذلت کی اس آیت میں بھی یہ بتایا گیا ہے کہ یہ دونوں چیزیں اللہ کے قانون مشیت کے مطابق ملتی ہیں۔ اور یہ بھی واضح کر دیا کہ وَمَا اللَّهُ يُرِيدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ (۴۰/۳۱) قرآن کا اعلان یہ ہے کہ خدا کا ہر فیصلہ حق و انصاف پر مبنی ہوتا ہے وَقُضِيَ بَيْنَهُم بِالْحَقِّ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ ملتا ہے۔ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ (۲۹/۶۹) اور کسی پر کسی قسم کا ظلم اور زیادتی نہیں ہوتی۔ سورہ یونس میں ارشادِ خداوندی ہے اِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَلَٰكِنَّ النَّاسَ أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ (۱۰/۴۴) یعنی خدا انسانوں پر ذرا سا بھی ظلم نہیں کرتا انسان خود اپنے آپ پر ظلم کر کے تباہ و برباد ہوتے ہیں۔ لیکن ان بندگانِ خدا کی کیفیت یہ ہے کہ جب ان میں سے کوئی ذلیل و خوار ہوتا ہے تو کہتا یہ ہے کہ رَبِّي أَهَانَنِ (۸۹/۱۶) خدا نے مجھے یونہی ذلیل و خوار کر دیا۔ اس کے جواب میں کہا گیا کہ ان سے کہہ دو کہ ان کی یہ سوچ بالکل غلط ہے۔ خدا کسی کو یونہی ذلیل نہیں

کیا کرتا۔ تم ذلیل ہوئے ہو اپنے غلط اعمال کے نتیجے میں۔ تم معاشرہ میں تنہا رہ جانے والے بے بس و مجبور لوگوں کی عزت نہیں کرتے تھے۔ جن کا کاروبار رُک جاتا تھا۔ تم انکی روٹی کا انتظام نہ کرتے تھے نہ ہونے دیتے تھے۔ تم تمام مال و دولت پر خود قابض ہو کر بیٹھ جاتے تھے۔ اچھی طرح جان لو کہ ایسی شیطانی ذہنیت اور ایسے ابلیسی نظام کا نتیجہ ذلت و خواری کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اس حقیقت کو سمجھ لو کہ خدا کسی کو ناحق ذلیل نہیں کرتا یہ ظلم ہے جس کا خدا کی ذاتِ اعلیٰ سے کوئی تعلق نہیں۔ خدا کا یہ عالمگیر قانون ہے کہ ذلت و خواری سے دوچار ہونا انسان کے اپنے کئے کا بھگتان ہوتا ہے اور ہر وہ قوم جو ضابطۂ قوانین کے ایک حصے پر اس لئے ایمان رکھے کہ اس سے اس کے مفادات محفوظ رہیں اور دوسرے حصے کو ماننے سے اس لئے انکار کر دے کہ اس سے وہ اپنی من مانیاں نہ کر پائے گا تو ان کے متعلق فیصلۂ خداوندی یہ ہے: خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰى اَشَدِّ الْعَذَابِ (۸۵/۲) وہ دنیا وی زندگی میں بھی ذلیل و خوار ہوتی ہے اور قیامت کے دن اس پر اس سے بھی زیادہ سخت عذاب مسلط کیا جائیگا۔ قرآن کے نزدیک انسان کی ہر مصیبت کے ذمہ دار اس کے اپنے انفرادی یا اجتماعی اعمال ہوتے ہیں۔ جیسا کہ سورہ بقرہ میں بنی اسرائیل کے متعلق بتایا گیا ہے کہ ان کی تباہی ان کے اپنے کئے کا نتیجہ تھی: وَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ (۲/۷۹) وہ ظالم اور فاسق تھے اس لئے ہلاک ہوئے (۵/۵۹)۔ وہ ذلت و خواری کے عذاب میں گرفتار ہوئے کیونکہ انہوں نے قوانینِ خداوندی سے سرکشی اختیار کر رکھی تھی (۲/۶۱)۔ اس کے برعکس جو لوگ حسن کارانہ انداز سے زندگی بسر کرتے ہیں اپنی ذات اور عالم انسانیت کو سنوارنے والے کام کرتے ہیں ان سے انکی زندگی حسن و توازن سے ہمکنار رہتی ہے۔ انہیں روسیاہی اور ذلت چھو کر نہیں جائیگی۔ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ ۭ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ ۭ۔ جنت انہی کا مقدر بنتی ہے ہمیشہ کے لئے اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ انسان کو اختیار و ارادہ کا جو شرف عطا کیا گیا ہے۔ وہی تو اس کو عزت و عظمت دلانے کا ذریعہ بنتا ہے۔ یہ شرف اسے دیا ہی اس لئے گیا ہے کہ وہ اس سے زندگی کی خوشگوار یاں اور سرفرازیاں حاصل کر سکے۔ سورہ مزمل میں ہے: وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ (۷۳/۲۰) جو خوشگواریاں بھی تم اپنے لئے پہلے سے بھیجو گے انہیں تم اللہ کے ہاں موجود پاؤ گے۔ قرآن کے بے شمار مقامات پر یہ نوید دی گئی ہے کہ اعمالِ صالحہ کا اجر دنیا و آخرت دونوں میں ملے گا۔ جسے قانونِ خداوندی کے مطابق یہاں عزت حاصل ہوگی اسے اگلی زندگی میں بھی عزیز اٹھایا جائے گا۔ اور جو یہاں ظلم و زیادتی کی وجہ سے ذلیل و خوار ہوگا اسے آخرت میں بھی ذلت نصیب ہوگی۔ یہ وہ حقائق ہیں جو قرآن بیان کرتا ہے۔ ادھر ہم ہیں کہ اسی قرآن کو صبح و شام پڑھنے کے باوجود ہماری عملی زندگیاں ان حقائقِ قرآنی سے کوئی واسطہ نہیں رکھتیں۔ پھر یہ کتاب مبین ہمارا ضابطۂ حیات کیونکر ٹھہری!

آیئے! ذرا اپنے دلوں کو ٹٹول کر اپنے ذہنوں کے بند دروازے کھول کر اس سوال کا جواب دیں۔ کیا ہم واقعی قرآن پر ایمان رکھتے ہیں؟

(ثریا عندلیب)

اُستاذُ المکرّم جناب غلام احمد پرویزؒ صاحب

★ پرویز صاحب ہم میں نہیں ہیں۔ ان کو فوت ہوئے ایک سال بیت گیا۔

★ بات چونکہ ہو رہی ہے قرآنِ کریم کی تعلیم کی، لہٰذا میرا یہ عرض کرنا یہاں ضروری ہے کہ بزرگانِ دین سے قرآن سنتے سنتے مجھے بچپن سال ہونے کو آئے ہیں لیکن فکر و نظر کا وہ اعلیٰ معیار، وہ تدبّر، وہ تحقیق، وہ پاکیزہ خیالات، اور وہ جامعیّت جو پرویز صاحب کی تحریر و تدریس سے مجھے نصیب ہوئی وہ شاید ہی کسی اور سے میسّر آئی ہو۔

★ ہم مسلمانوں سے وہ ساری عمر ہمکلام رہے اور اسلام کی تبلیغ کے سلسلے میں قرآن کی آیات پر بڑی وضاحت سے انہوں نے نکات بیان کئے۔ عہدِ رفتہ اور عہدِ حاضر کے تقاضوں کو، آنے والے وقتوں کی ضروریات کو، قرآن کے دائمی زاویوں سے آپ نے پہچانا اور کتابُ اللہ کی ارفع اقدار کو خصوصیّت سے بیان فرمایا۔ قرآنِ حکیم کی تعلیم ہی ان کا مرکزی خیال رہی اور یہی وہ بنیادی نظریہ تھا جس کی اشاعت پر وہ توجہ فرماتے رہے اور قوم کی اجتماعی بیداری سے سروکار رکھا۔ جہاں وہ ادبی تحریر اور شعری ذوق میں اونچے مقام پر فائز تھے۔ وہاں ان کی بصیرت کے خصوصی پہلو کا انداز یہ تھا کہ وہ

★ اللہ تعالیٰ کی ذات کا ایک اعلیٰ و ارفع تصوّر رکھتے اور اسی کی محکومیّت اختیار کرنے کو کہتے۔

★ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اُن کو والہانہ محبت تھی۔ ہمیشہ گہری عقیدت کا اظہار فرماتے۔

★ قرآنِ کریم کے قوانین اور فلسفۂ زندگی پر ان کی گہری نظر ہوتی۔

★ ملّتِ اسلامیہ میں مذہبی فرقہ بندی اور مشرکانہ رسوم سے سخت نالاں تھے اور تمام تر مصائب کا اس غیر اسلامی رویّے کو ذمّہ دار قرار دیتے۔

★ احادیث نبویؐ اور فرمودۂ رسولؐ سے گہرا تعلق اور لگاؤ رکھتے اور بیان کرتے وقت انتہائی

عقیدت کا مظاہرہ فرماتے۔

- ★ وضعی اور فرسودہ روایات اور غیر قرآنی اعتقادات پر بھرپور تنقید کرتے اور دینِ اسلام کے دشمن کی اسے سازش قرار دیتے۔
- ★ مغرب و مشرق کے فلاسفروں اور زمانے کے جدید مفکروں سے اپنے علمی روابط سے استفادہ کرتے اور کتاب اللہ کے آئین اور آئینے سے مختلف نظریات و تصورات کو پرکھتے۔
- ★ نوعِ انسان کی ہر دو جنس، مرد اور عورت کو قرآن کی رُو سے ایک سطح پر دیکھتے۔
- ★ تحریر و تقریر میں حق بات کو بےخوف و بےخطر کہتے اور ایسا کچھ کہنے اور لکھنے میں شگفتگی اور شائستگی کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔
قرآنِ حکیم کے مفہوم اور اس کی ساخت اور اس کا تعیّن — قرآن کے حوالے سے — تسلسل کے ساتھ قائم رکھتے۔
- ★ افتتاح سے لے کر اختتام تک اللہ کی اس زندہ کتاب کو تضاد و تنسیخ کے باطل عقائد سے منزّہ اور بحفاظت لوگوں تک پہنچاتے۔
- ★ جو نقوش وہ چھوڑ گئے، جو عالمانہ اور ادبی باتیں وہ کہہ گئے، جو شمع وہ روشن کر گئے، جو رشتہ وہ قائم کر گئے، وہ ہم قرآنِ مجید کے طالب علموں کے لئے ناقابلِ فراموش رہے گا۔
- ★ مرحوم کی تصانیف موجود ہیں۔ قرآن کریم کی تعلیم و حکمت پر فکر انگیز خیالات لکھے ملتے ہیں۔ ذی شعور اور اہلِ علم کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ مطالعہ کریں اور قومی ابتلا کے اس زمانے میں ملّتِ اسلامیہ کو فکری جمود سے نجات دلائیں۔
- ★ میں خدائے تعالیٰ کے حضور سربسجود ہوں کہ وہ اپنی خاص رحمت سے اُستاذُ المکرّم پرویز صاحب کو، ان کی آخروی زندگی میں، بلند درجات سے سرفراز فرمائے

(حافظ محمد یعقوب خان، تاجیک)

لاہور کے سامعینِ درس متوجہ ہوں

درسِ قرآن بذریعہ وی سی آر (R-C-V) ہر جمعہ کی صبح ۹ بجے ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور میں ہوتا ہے۔

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

باسمہٖ تعالیٰ

حسنِ کردار کا نقشِ تابندہ

(قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ)

(مسلسل)

انگریز کے خلاف

جن لوگوں کے دل میں تحریکِ پاکستان کے خلاف خبثِ باطن اور قائدِ اعظمؒ کے خلاف، آتشِ انتقام شعلہ زن ہے وہ ان کی ذات پر، منجملہ دیگر خرافات، یہ الزام بھی لگایا کرتے ہیں کہ تحریکِ تقسیمِ ہند، انگریزوں کی سکیم تھی اور قائدِ اعظمؒ ان کا آلۂ کار تھا۔ میں اس سلسلہ میں دو ایک ایسی شہادات پیش کرنا چاہتا ہوں جن سے واضح ہوگا کہ تحریکِ پاکستان کے دوران قائدِ اعظمؒ نے ہندوؤں کے ساتھ انگریزوں کو بھی کس طرح للکارا، اور کس طرح ہر موقع پر ان کے خلاف ڈٹ کر کھڑے ہو گئے، جب انہوں نے ۱۹۴۲ء میں دیکھا کہ انگریز ہندوؤں کی "ہندوستان چھوڑو" کی جارحانہ کارروائیوں سے مرعوب ہو کر، ان کی طرف جھکتا جا رہا ہے تو انہوں نے اپنی ایک تقریر میں برملا کہا کہ

> اگر ہندو اور انگریز نے کوئی ایسا سمجھوتہ کر لیا تو غیر ملکی سنگینوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے جن کے سائے میں کانگریسی راج رچایا جا رہا ہوگا، ہم ملک کے سارے نظام میں زلزلہ ڈال دینگے اور اسے مفلوج اور معطل بنا کر رکھ دیں گے۔ اسے تسلیم کرنا ہمارے لئے انتہائی اندوہناک اور سنگین نتائج کا موجب ہوگا۔ اس ظالمانہ اقدام سے برِصغیر کے مسلمانوں کا مستقبل تیرہ و تار ہو جائے گا اور ان کی آزادی پر خطِ تنسیخ کھینچ جائے گا۔

اس سے پہلے ایک مرتبہ جب مسٹر گاندھی نے بھی قائدِ اعظمؒ کے خلاف یہ الزام عائد کر دیا کہ مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے جناحؒ صاحب کی امیدیں دولتِ برطانیہ سے وابستہ ہیں۔ کوئی چیز جو کانگریس کرے اور دے، انہیں مطمئن نہیں کر سکتی۔

تو انہوں نے کھٹ سے جواب دیا کہ

یہ قطعی افترا اور مسلمانانِ ہند کی توہین ہے جس کا مسٹر گاندھی جیسے مرتبہ کی شخصیت کو مرتکب نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ میں مسٹر گاندھی کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ مسلمانانِ ہند اپنی اور صرف اپنی طاقت پر بھروسہ کئے ہوئے ہیں۔ ہم نے اپنے حقوق اور مفادات کے تحفظ کے لئے کانگریس اور برطانیہ دونوں کے خلاف آخری خندق تک لڑنے کا عزم کر رکھا ہے۔ اور کسی دوسرے پر تکیہ نہیں کرنا چاہیئے۔

قائدِ اعظمؒ تو یہ کہہ رہے تھے، اور مسٹر گاندھی جو قائدِ اعظمؒ کے خلاف اس قسم کے الزامات تراش رہے تھے، ان کی اپنی حالت یہ تھی کہ انہوں نے ۲۲ اکتوبر ۱۹۳۹ء کے جریدہ اسٹیٹسمین میں، برطانوی سامراج کے علیٰ حالہ قائم رکھے جانے کی تائید میں لکھا تھا کہ

تھوڑی دیر کے لئے غور کیجئے کہ اگر انگریز اچانک ملک کو خالی کر دیں تو کیا ظہور پذیر ہوگا؟ اگر ملک میں حکومت کرنے کے لئے کوئی بیرونی حکومت موجود نہ ہو تو اس بات سے انکار کرنا مشکل ہے کہ پنجابی خواہ وہ مسلمان ہوں یا سکھ، ہندوستان کو اپنی جولاں گاہ بنا لیں گے ..... ہم نے ملک میں جمہوریت کا جو ڈھونگ رچا رکھا ہے تو وہ صرف انگریز کی سنگینوں کی امداد پر منحصر ہے۔ پس اگر کسی کو یہ ضرورت ہے کہ کسی طاقتور عنصر کی دست بُرد سے ملک کو بچانے کے لئے انگریز یہاں موجود رہیں تو وہ کانگریسی ہندو اور وہ دیگر لوگ ہیں جن کی نمائندگی کا کانگریس کو دعویٰ ہے۔

مسٹر گاندھی کو انگریزوں کے ہندوستان سے چلے جانے کا غم یوں ستا رہا تھا۔ اس کے برعکس قائدِ اعظمؒ لندن ٹائمز کے ایک مقالہ کا جواب دیتے ہوئے حکومت برطانیہ پر واضح کر رہے تھے کہ

میں بلا خوفِ تردید یہ کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ مسلم لیگ، ملّتِ اسلامیہ کی نمائندگی اس سے زیادہ صحیح معنوں میں اور مؤثر طریق پر کر رہی ہے جس طرح کہ ملک معظم کی موجودہ حکومت برطانوی قوم کی کر رہی ہے۔ اگر اخبار "ٹائمز" کا یہ خیال ہے کہ حکومتِ برطانیہ کے سائے میں مسلمانوں کی رضامندی اور منظوری کے بغیر کوئی فیصلہ ان کے سر منڈھا جا سکتا ہے تو وہ شدید غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ مسلمان قطعاً اس کے لئے تیار نہیں کہ اپنی تقدیر اور مستقبل کو کسی دوسرے کے ہاتھ میں چھوڑ دیں۔ یہ آخری فیصلہ خود مسلمان ہی کر سکتے ہیں کہ کیا کچھ ان کے لئے بہتر ہے بنا بریں وہ تمام عناصر جو ہندوستان کے مستقبل کی تشکیل میں حصّہ دار ہیں، ان سب پر لازم ہے کہ مسلمانوں کو ایک معزز اور ذمّہ دار قوم متصوّر کریں۔

۱۹۴۰ء کے شروع میں کچھ ایسا محسوس ہوا کہ ہندو اور انگریز ہندوستان کے مستقبل کے متعلق مسلمانوں کے علی الرغم کوئی سکیم تیار کر رہے ہیں۔ اس پر قائدِ اعظمؒ نے راجکوٹ سے بیان شائع کیا جس میں انتہائی پُرجلال انداز میں کہا کہ

میں انتباہ کئے دیتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ وائسرائے اور حکومتِ برطانیہ پورے طور پر اس حقیقت کو سمجھ لیں گے کہ ماضی کی صورتِ حال کا اعادہ کیا گیا یا ان ضمانتوں کو پورا نہ کیا گیا جو دی جا چکی ہیں یا ان کا احترام ملحوظ نہ رکھا گیا تو ہندوستان میں نہایت ہی خطرناک صورتِ حال پیدا ہو جائے گی۔ مسلم ہندوستان ان تمام ذرائع سے جو اس کے اختیار میں ہیں، ایسی صورتِ حال کا مقابلہ کرے گا اور کسی قربانی سے دریغ نہیں کرے گا۔

اسی طرح انہوں نے انگلستان کے اخبار ڈیلی سیل کے نمائندہ کو ایک بیان دیا جس میں واشگاف الفاظ میں کہا کہ

مجھے بتا دینا چاہیئے کہ اب ایک بات یقینی ہے اور وہ یہ کہ اسلامی ہندوستان اپنے مستقبل یا اس ملک کے دستور کی تشکیل میں اپنے حقوق کو مسٹر گاندھی کے مفروضہ ٹریبونل یا کسی اور طرز کے ادارے کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑے گا۔ نہ اسلامیانِ ہند اس پر تیار ہیں کہ حکومتِ برطانیہ کے آخری فیصلہ کو قبول کر لیں۔ ہمارے لئے کیا کچھ بہترین ثابت ہو سکے گا، اس کا قطعی اور آخری فیصلہ خود اسلامیانِ ہند کی منشا پر موقوف ہے، اور وہی اس کے آخری جج ہوں گے۔

ماؤنٹ بیٹن کا اعتراف

اس موضوع پر میں بکثرت دیگر شہادات بھی پیش کر سکتا تھا، لیکن قلتِ گنجائش اس کی مانع ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس سے خبثِ باطن کی طرف سے عائد کردہ اس اتہام کی تردید ہو گئی ہو گی کہ تقسیم ہند کی سکیم برطانیہ کی تخلیق تھی، اور قائدِ اعظم اس کے آلۂ کار بن کر کٹھ پتلی کا رول ادا کر رہے تھے۔ لیکن ان شہادات میں اگر کسی اضافہ کی ضرورت ہے تو میں اسے بھی پیش کئے دیتا ہوں۔ تقسیم ہند، لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ہاتھوں عمل میں آئی تھی، ۱۹۷۵ء کے اواخر میں بی۔ بی۔ سی لندن سے اس کا ایک انٹرویو براڈ کاسٹ ہوا تھا۔ اس میں اس سے سوال کیا گیا کہ

کیا اس وقت، ہندوستان کو متحد رکھنے کا کوئی امکان تھا؟

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اس سوال کا جواب ان الفاظ میں دیا:۔

میں ہندوستان گیا ہی اس مقصد کے لئے تھا کہ اُسے کسی طرح متحد رکھ سکوں۔ ہم صدیوں کے بعد اس ملک کو چھوڑ رہے تھے، تو چاہتے تھے کہ اُسے ایک متحد ملک کی شکل میں چھوڑ کر جائیں۔ اگر ایسا ہو سکتا تو یہ ایک عظیم کارنامہ ہوتا۔ اس کا ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا ایک الم انگیز حادثہ تھا جس سے ہندوستان کی قوت پارہ پارہ ہو جاتی۔ لہٰذا میں نے اس مقصد کے لئے انتہائی کوشش کی۔ لیکن اس کی راہ میں ایک ایسا شخص حائل تھا جو پہاڑ کی طرح رکاوٹ بنے کھڑا تھا۔ اور وہ تھا مسٹر محمد علی جناحؒ۔ صدر مسلم لیگ۔ جو شروع ہی سے "نہ" کہتا چلا گیا اور اس کے اس ارادہ کو بدلنے کے لئے میری ہر کوشش ناکام رہ گئی۔ مجھے

بالآخر اس کے سامنے جھکنا پڑا۔
مَیں سمجھتا ہوں کہ اس باب میں، اس سے زیادہ کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں۔

(۰)

قائدِ اعظمؒ کی سیاست کا یہ انتہائی باکمال کارنامہ ہے کہ انہوں نے یہ چومکھی لڑائی اس انداز سے لڑی کہ نہ کوئی ہنگامہ کھڑا کیا، نہ جلاؤ گھیراؤ کے فسادات برپا کئے۔ نہ شورشیں اٹھائیں، نہ اینٹ پتھر برسائے۔ صرف اپنے تدبّر، فراست اور عظمتِ کردار سے یہ مہیب جنگ اس طرح جیت لی کہ تاریخ اس پر آج تک انگشت بدنداں ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ اس معرکہ آرائی میں ان کے سامنے کوئی خطرات نہیں تھے۔ تحریک کے دوران تو انہوں نے ان خطرات کا ذکر کرنا مناسب نہ سمجھا، البتہ تشکیلِ پاکستان کے بعد ۱۹۴۸ء میں کراچی کلب میں انہوں نے اپنی محترمہ بہن، مس فاطمہ جناح (مرحومہ) کی جانفشانیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ

جن دنوں مجھے برطانوی حکومت کے ہاتھوں کسی وقت بھی گرفتاری کی توقع تھی تو ان دنوں میری بہن فاطمہ ہی تھی جو میری ہمّت بندھاتی تھی۔ جب حالات کے طوفان مجھے گھیر لیتے، تو میری بہن ہی تھی جو میری حوصلہ افزائی کرتی تھی۔ تفکّرات، پریشانیوں اور سخت محنت کے زمانے میں جب میں گھر آتا تھا تو میری بہن روشنی اور امید کی تیز شعاع کی صورت میں میرا خیر مقدم کرتی تھی۔ اگر میری بہن نہ ہوتی تو میرے تفکّرات کہیں زیادہ ہوتے، میری صحت کہیں زیادہ خراب ہوتی۔ اس نے لاپروائی سے کام نہیں لیا۔ کبھی شکایت نہیں کی۔ میں آج ایسے واقعات کا انکشاف کرتا ہوں جو غالباً آپ نہیں جانتے۔ ایک وقت ایسا بھی آیا تھا کہ ہمیں ایک عظیم انقلاب کا سامنا تھا۔ ہم گولیوں کی بوچھاڑ میں حتیٰ کہ موت تک کے مقابلہ کے لئے آمادہ اور تیار تھے۔ میری بہن نے ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالا، میرے شانہ بشانہ رہی۔ میری انتہائی معتمد رہی اور مجھے سنبھالے رکھا۔ (فاطمہ جناح۔ "میرا بھائی" بحوالہ ماہنامہ فکر و نظر۔ اگست ۱۹۷۶ء۔ صـ۱۲۰)

جب ۱۹۴۶ء میں قائدِ اعظمؒ نے راست اقدام کا فیصلہ کیا تو اس پر تبصرہ کرتے ہوئے بمبئی کے مشہور کانگریسی ہفتہ وار اخبار بلٹز نے لکھا تھا کہ

مسلم لیگ کے بدترین دشمن بھی مسٹر جناحؒ کی لیڈرشپ (قیادت) کو رشک کی نگاہوں سے دیکھنے پر مجبور ہوں گے۔ لیگ نے پچھلے ہفتے جو عظیم انقلابی فیصلہ کیا ہے اس سے ہمارے دلوں میں بے ساختہ یہ آرزو اُبھرتی ہے کہ کاش! انڈین نیشنل کانگریس میں، جناحؒ جیسے مسلّم الثبوت تدبّر کا ماہر کوئی ایک لیڈر ہوتا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسٹر جناحؒ کے اس فیصلے نے، انگریز اور کانگریس دونوں کو بوکھلا کر رکھ دیا ہے۔ اور اس عامیانہ الزام کی دھجیاں بکھیر دی ہیں کہ مسلم لیگ، برطانوی استعمار کی پروردہ جماعت ہے۔
(اصفہانی۔ صـ۱۸۸)

قائدِ اعظمؒ نے ۱۹۴۸ء میں اس راز کو منکشف کیا تھا کہ تحریکِ پاکستان کے دوران ایسے وقت بھی آئے تھے جب ہر آن ان کی گرفتاری کا امکان تھا۔ اس راز کو انہوں نے اپنی بہن، محترمہ فاطمہ جناح (مرحومہ) کی جاں نثارانہ خدمات کا ذکر کرتے ہوئے افشا کیا۔ لیکن اس قدر جاں نثار اور رفاقت شعار بہن کو بھی انہوں نے، کوئی عہدہ دینا تو ایک طرف، مسلم لیگ میں بھی کوئی منصب تفویض کرنا پسند نہ کیا کہ اس میں اقربا نوازی کا شائبہ ہوتا جس نے ہماری حیاتِ ملی کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ اقربا نوازی کا ایک موقعہ ان کے سامنے آیا جسے ان کی دوسری ہمشیرہ، محترمہ شیریں بائی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

جب مرحوم چندریگر نے قائدِ اعظمؒ کے لائق بھانجے، اکبر پیر بھائی کو مقامی مسلم لیگ کی کسی ذیلی کمیٹی کا چیئرمین بنانے کی تجویز قائدِ اعظمؒ کو پیش کی تو انہوں نے اسے یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ اکبر کی سب سے بڑی "نا اہلیت" یہ ہے کہ وہ میرا رشتہ دار ہے۔

(جنگ کراچی۔ ۹ جولائی ۱۹۷۲ء۔ بحوالہ ماہنامہ فکر و نظر۔ اگست ۱۹۷۶ء)

اس سے آپ قائدِ اعظمؒ کے حسنِ کردار ہی کا نہیں، دور نگہی اور مآل اندیشی کا بھی اندازہ لگا لیجئے۔ اس کے ساتھ یہ بھی دیکھئے کہ اس مردِ جلیل نے یہ ساری لڑائی کس ساز و سامان کے ساتھ لڑی تھی۔ انہوں نے اپنی ایک تقریر میں پہلے ان مشکلات کا ذکر کیا جو حصولِ پاکستان کی راہ میں درپیش تھیں اور کہا کہ "اگرچہ میں نے یہ بات صاف اور واشگاف الفاظ میں بیان کر دی ہے، لیکن میں شکست تسلیم کرنے کا بھی قائل نہیں۔ مجھے اپنی قوم پر بھروسہ ہے۔" اس کے بعد انہوں نے کہا:۔

اورنگ زیب روڈ (نئی دہلی) پر میری نجی قیام گاہ کو شاید رشک کی نگاہوں سے دیکھا جائے مگر یہ تو دیکھئے کہ ہمارا سیکرٹریٹ کہاں ہے اور فوج کہاں! میرا اسلحہ خانہ اس قدر ہے۔ ایک اٹاچی کیس (جسے انہوں نے جلسہ میں نمایاں کر کے دکھایا تھا) ایک ٹائپ رائٹر۔ اور ایک پرسنل اسسٹنٹ (بس یہ ہے ہمارا ساز و یراق اور اسلحہ اور فوج)۔

(عربک کالج۔ دہلی ۱۹۴۲ء۔ بحوالہ طلوعِ اسلام۔ اکتوبر ۱۹۴۸ء)

سچ کہا تھا اقبالؒ نے ؎

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پُرسوز — یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

اس ساز و سامان کے ساتھ لڑنے والا قائد، کبھی لڑائی نہیں ہارتا۔ قائدِ اعظمؒ کے اپنے الفاظ میں:۔

اخلاقی قوت، جرأت، محنت اور استقلال وہ چار ستون ہیں جن پر انسانی زندگی کی پوری عمارت تعمیر کی جا سکتی ہے۔ میں کبھی ناکامی کے لفظ سے آشنا نہیں ہوا۔

لیکن ان چار میں ایک اور جزو کو بھی شامل کرنا چاہیئے اور وہ ہے خونِ جگر جس کے بغیر اقبالؒ کے الفاظ میں، ہر نقش ناتمام رہ جاتا ہے۔ شعرِ اقبالؒ میں تو "خونِ جگر" کے الفاظ استعارہ کے طور پر استعمال ہوئے ہیں، لیکن قائدِ اعظمؒ نے سچ مچ اپنے خونِ جگر سے اس نقش کی تکمیل کی تھی۔

قائدِاعظمؒ کی صحت

یہ داستان عبرت آموز بھی ہے اور دل سوز بھی جسے میں باچشمِ نم بیان کرسکوں گا۔ آپ بھی دل تھام کر سنیئے۔ قائدِاعظمؒ کی صحت ایک عرصہ سے خراب چلی آرہی تھی۔ محترمہ مس فاطمہ جناح (مرحومہ) کا بیان ہے کہ

ہم ۱۹۴۰ء میں بمبئی سے دہلی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے لئے روانہ ہوئے۔ کچھ دنوں سے قائدِاعظمؒ کو بخار کی شکایت تھی۔ قائدِاعظمؒ نے کھانا کھایا اور بستر پر لیٹ گئے۔ اچانک انہوں نے اونچی اونچی آہیں بھرنا شروع کردی جیسا کہ کسی آدمی کو گرم لوہے کی سلاخ سے چھوا جائے۔ میں اسی لمحے ان کے پاس پہنچی اور تکلیف کی وجہ دریافت کی اور قائدِاعظمؒ نے ہاتھ کے اشارے سے دردزدہ جگہ کی نشان دہی کی۔ درد کی شدت سے ان کی قوتِ ناطقہ جواب دے چکی تھی۔ میں نے دردزدہ جگہ کو ہاتھ لگایا تو ناامید ہوکر اگلے سٹیشن کے آنے کا انتظار کرنے لگی تاکہ گرم پانی دینے کے لئے گرم پانی کی بوتل کا انتظام کروایا جائے۔ اگلے چند لمحوں میں گاڑی رُکنے کی آواز آئی تو میں نے گارڈ کو بلوایا اور گرم پانی کی بوتل لانے کو کہا۔ نیپکن میں لپیٹ کر بوتل کو مأوف جگہ پر رکھا جس سے درد میں کچھ کمی محسوس ہوئی۔
(میرا بھائی۔ صـ۴)

اسی طرح مرحومہ نے ایک اور واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے:۔

۱۹۴۱ء میں ہم بمبئی سے مدراس روانہ ہوئے جہاں قائدِاعظمؒ نے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت کرنی تھی۔ جب ہماری گاڑی مدراس سے کچھ دُور تھی تو قائدِاعظمؒ اپنی نشست سے اُٹھے۔ میں یہ دیکھ کر پریشان ہوئی کہ وہ چند قدم چل کر ریل کے لکڑی سے بنے ہوئے فرش پر گر پڑے۔ میں فوراً ان کے پاس پہنچی اور تکلیف کی وجہ معلوم کی۔ قائدِاعظمؒ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے کہ میں تکان اور کمزوری محسوس کرتا ہوں۔ اور پھر قائدؒ میرے کندھوں کا سہارا لے کر اپنے برتھ کی طرف بڑھے۔ خوش قسمتی سے گاڑی سٹیشن پر پہنچی جہاں ہزاروں مسلم لیگی قائد کا استقبال کرنے کھڑے قائدِاعظمؒ زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ میں نے دروازہ کھولا اور زور سے چلّا کر کہا کہ زیادہ شور نہ کریں کیوں کہ قائدِاعظمؒ تکان اور بخار کی وجہ سے بستر پر ہیں۔ دوڑ کر ڈاکٹر لے آئیں۔ چند لمحوں میں ڈاکٹر آیا۔ اس نے معائنے کے بعد کہا کہ فکرمند ہونے کی کوئی بات نہیں۔ ذرا نبض گر گئی تھی۔ (میرا بھائی۔ صـ۴)

صحت کی اس قدر کمزوری کا تقاضا تھا کہ قائدِاعظمؒ آرام کرتے۔ مرحومہ کا بیان ہے کہ وہ جب بھی انہیں آرام کرنے کے لئے کہتیں تو وہ جواب میں کہتے کہ

فاطمہ! کیا تم نے کبھی یہ سنا ہے کہ ایک جرنیل چھٹی پر چلا جائے جبکہ اس کی فوج اپنی بقا

اور سلامتی کی جنگ میں مصروف ہو! (میرا بھائی - ص۱۳)

اس جرنیل نے چھٹی نہ لی اور محض اپنی قوتِ ارادی اور مقصد پیشِ نظر سے عشق کے بل بوتے پر مسلسل اور پیہم مصروفِ جنگ رہا ——— بلکہ پہلے سے بھی زیادہ شدّت اور تن دہی کے ساتھ۔ لیکن یہ قوتِ ارادی، فطرت کے اٹل قانون کا کب تک اور کہاں تک مقابلہ کرتی۔ آخر کار ایک ایسا واقعہ ظہور میں آیا جسے اس فدائے ملّت نے خاص اہتمام سے راز میں رکھا ——— حتیٰ کہ اس نے اپنی زندگی کی سب سے زیادہ معتمد علیہ رازداں، بہن کو بھی شریک نہ کیا۔ یہ راز، راز ہی رہتا اگر اسے، لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی ذاتی ڈائری کے اوراق افشا نہ کرتے۔ یہ ڈائری ۱۹۷۵ء میں (فریڈم ایٹ مڈنائٹ) نامی کتاب میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ تیزی سے گرتی جانے والی صحت کے متعلق قائدِ اعظمؒ نے اپنے ذاتی ڈاکٹر (جو پارسی تھا) سے مشورہ کیا۔ اس نے "ایکس رے" لے کر کہا کہ آپ کے دونوں پھیپھڑے بُری طرح دِق آلود ہو چکے ہیں۔ اگر آپ نے کامل آرام اور سکون اختیار نہ کیا تو آپ زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکیں گے۔"

آپ کو معلوم ہے کہ اس پر قائدِ اعظمؒ نے کیا کہا؟ انہوں نے ڈاکٹر سے کہا کہ نہ اس ایکس رے کو کسی کے سامنے آنا چاہیئے اور نہ ہی اس بات کا تذکرہ تمہاری زبان پر۔ چنانچہ ایکس رے کی وہ فلم بھی سربمہر ہو گئی اور ڈاکٹر اور مریض کے لب بھی سِل گئے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس راز کو سربمہر رکھنے سے مقصد کیا تھا، اسے اسی کتاب کے مصنفین کی زبان سے سنئے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ

> اگر ماؤنٹ بیٹن، جواہر لال نہرو یا مہاتما گاندھی، اپریل ۱۹۴۷ء میں اس سربمہر راز سے واقف ہو جاتے تو تقسیمِ ہند کا حادثہ کبھی رونما نہ ہوتا۔

———(o)———

ناقابلِ خرید

اس مردِ مجاہد نے، اس "حادثہ" کو سربمہر رکھنے کے لئے، اپنے خونِ جگر کا آخری قطرہ تک نچوڑ کر رکھ دیا۔ اس کا یہ خونِ جگر رنگ لایا۔ اس نے جان دے کر، اس عظیم مملکت کو حاصل کر لیا اور بلا مزد و معاوضہ ہم نا اہلوں کو اس کا وارث بنا کر خاموشی سے دُنیا سے چلا گیا۔ ان کی وفات پر، دنیا بھر کے عظیم مشاہیر نے (جن میں دوست اور دشمن سب شامل تھے) انتہائی احترام و تکریم کے ساتھ ان کی بارگاہ میں خراجِ تحسین پیش کیا۔ اگرچہ ان گل ہائے عقیدت کی ایک ایک پتی اپنی جگہ منفرد اہمیت کی حامل ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مسز سروجنی نیڈو نے (قائدِ اعظمؒ کی زندگی میں) ان کے متعلق جو کچھ کہا تھا، وہ ان کی عظمتِ کردار کی سب سے زیادہ درخشندہ دلیل ہے۔ اس نے کہا تھا کہ

> میں بڑی مدّت سے مسٹر جناحؒ کو جانتی ہوں۔ ان کے بارے میں خواہ کوئی رائے بھی قائم کی جائے، لیکن میں یہ پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ انہیں کسی قیمت پر بھی خریدا نہیں جا سکتا۔

۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت، ہندوستان کو فیڈریشن بنانے کی سکیم پیش کی گئی تو ...

نے اس کی سختی سے مخالفت کی۔ انگریز کی انتہائی خواہش تھی کہ وہ سکیم پروان چڑھ جائے۔ قائدِ اعظمؒ کو ہموار بنانے (بلکہ یوں کہیئے کہ خریدنے کے لئے) برطانیہ کے وزیرِ اعظم لارڈ رمزے میکڈانلڈ نے انہیں ذاتی ملاقات میں کہا کہ

اگر سنہا ایک صوبے کا گورنر بن سکتا ہے تو کوئی اور بھی بن سکتا ہے۔ اگر سنہا لارڈ کا خطاب حاصل کر سکتا ہے تو کوئی اور بھی حاصل کر سکتا ہے۔

اس نے سمجھا کہ صوبے کی گورنری یا لارڈ کا خطاب اپنی بیش بہا قیمت ہے جس کے عوض کسی ہندوستانی کو بھی آسانی سے خریدا جا سکتا ہے۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اس کے جواب میں قائدِ اعظمؒ نے کیا کہا۔ انہوں نے ایک لفظ بھی نہ کہا اور خاموشی سے وزیرِ اعظم کے کمرے سے باہر نکلنے لگے۔ اس پر رمزے میکڈانلڈ بے حد متعجب ہوا اور قائدِ اعظمؒ سے الوداعی الفاظ کہنے کے ساتھ، یہ پوچھ ہی لیا کہ آپ کا ایسا ردِ عمل کیوں ہے؟ قائدِ اعظمؒ نے اس کے جواب میں انتہائی متانت سے کہا کہ

اب میں آپ سے آئندہ کبھی نہیں ملوں گا۔ کیونکہ آپ مجھے بکاؤ مال سمجھتے ہیں۔

(بحوالہ چٹان - ۱۶/۸/۴۶)

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بے باکی اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

یہ تو ایک صوبے کی گورنری کی پیش کش تھی۔ اس کے بعد ایک ایسا وقت آیا جب انہیں پورے ہندوستان کی حکومت کی پیش کش کی گئی۔ ۱۹۴۰ء کی قراردادِ پاکستان کے بعد، تقسیمِ ہند کی سکیم کی مخالفت کرتے ہوئے کانگریس کے بزرگ ترین لیڈر، مسٹر راج گوپال اچاریہ نے کہا کہ

اگر ملکِ معظم کی حکومت ایک نیشنل گورنمنٹ کی تشکیل پر آمادہ ہو تو میں کانگریسی رفقاء کو اس پر راضی کرنے کی کوشش کروں گا کہ مسلم لیگ اپنا وزیرِ اعظم نامزد کر دے اور اسے قومی حکومت متشکل کرنے کا موقع دے۔ میں نے شروع ہی میں مسٹر جناحؒ کو یہ پیش کش اس لئے نہیں کی تھی کہ وہ اسے بچاطور پر اپنی ہتک خیال کرتے ہوئے یہ دندان شکن جواب دے سکتے تھے کہ میں ملازمتوں کے پیچھے نہیں پڑا ہوا۔ (طلوعِ اسلام - جون ۱۹۷۶ء)

قائدِ اعظمؒ نے اسمبلی کی تقریر میں اس کا جواب یوں دیا:-

اگر مسٹر ایمرے (یعنی نمائندہ حکومتِ برطانیہ) اس تجویز کو منظور کر لیتے اور اس کے بعد مجھے یہ پیش کش کی ہوتی تو کیا یہ اس وقت بھی میری طرف سے اس کا وہی دندان شکن جواب نہیں ہو سکتا تھا کہ مسٹر ایمرے اور راج گوپال اچاریہ دونوں میری ہتک کر رہے ہیں۔ میں ملازمتوں کے پیچھے نہیں پڑا ہوا ہوں۔

اور اس تقریر کے آخر میں، یہ غلغلہ انگیز اعلان کیا کہ

ہم نے آخری اور حتمی فیصلہ کر لیا ہے کہ پاکستان ہمارا واحد نصب العین ہے۔ ہم اس کی خاطر مسلسل جدوجہد کریں گے اور اپنی جانیں تک قربان کر دیں گے۔ کسی کو بھی اس بارے میں غلط فہمی نہیں رہنی چاہیئے۔ جمہوری نظامِ حکومت کا جنازہ نکل چکا ہے۔ ہماری تعداد بے شک کم ہے لیکن حکومت کو معلوم

ہونا چاہیئے کہ اگر ہم اس کا تہیّہ کرلیں تو قلّتِ تعداد کے باوجود، ہم تمہارے لئے اس سے سو گنا مشکلات پیدا کر سکتے ہیں جو کانگرس نے آج تک کی ہیں۔ یہ ایک دھمکی نہیں، بلکہ ایک حقیقت کا اعلان ہے جس سے میں تمہیں متنبہ کر دینا چاہتا ہوں۔

لارڈ ٹمرّے میکڈ انالڈ کو جو جواب ملا تھا وہ آپ پہلے سُن چکے ہیں۔ اب یہ سنیئے کہ ہندوستان کے وائسرائے، لارڈ لِن لتھ گو کے ساتھ کیا بیتی تھی۔ واضح رہے کہ لارڈ لِن لتھ گو، اپنے رعب وداب اور دبدبہ وطنطنہ کے لئے مشہور تھا۔ بات یوں ہوئی کہ وائسرائے نے وار کونسل مقرر کی اور اس میں مسلم لیگی وزراء، مولوی فضل الحق اور سر سکندر حیات خان کو بھی شامل کر لیا۔ قائدِاعظمؒ نے وار کونسل کا بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا اور ان دونوں حضرات سے کہا کہ وہ کونسل سے مستعفی ہو جائیں۔ جب وائسرائے کو اس کا علم ہوا تو اس نے قائدِاعظمؒ کو ملاقات کے لئے بلا بھیجا۔ ملاقات کے لئے گیارہ بجے صبح کا وقت مقرر تھا، لیکن قائدِاعظمؒ ٹیلی فون پر بار بار یاد دہانی کے باوجود، سوا گیارہ بجے سے پہلے وائسر یگل لاج نہ پہنچے۔ وہاں جا کر، بغیر کسی معذرت کے وائسرائے سے ملاقات کا مقصد پوچھا۔ اس نے کہا کہ آپ کو میرے بیان سے کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں اس کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔

آپ کو معلوم ہے کہ قائدِاعظمؒ نے اس کے جواب میں کیا کیا؟ آپ اُٹھ کھڑے ہوئے اور وائسرائے سے یہ کہتے ہوئے کہ "مجھے آپ کی وضاحت کی کوئی ضرورت نہیں"۔ کمرے سے باہر نکل گئے۔

اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک ممتاز ہندو لیڈر، مسٹر کانجی دوارکا داس نے اپنی کتاب ——— (INDIA'S FIGHT FOR FREEDOM) میں لکھا ہے:-

> یہ دیکھ کر دل میں مسرّت کی ایک لہر دوڑ اٹھتی ہے کہ ہندوستان میں، مسٹر جناحؒ کی قامت اور دیانت کا کم از کم ایک لیڈر تو ایسا تھا جس میں اس قدر صداقت اور بے باکی تھی کہ اس نے انگریز وائسرائے کے منہ پر کہہ دیا کہ وہ اسے کیا سمجھتا ہے جبکہ باقی ہندوستانی لیڈر، جن میں کانگریس ہائی کمان بھی شامل ہے، اس وائسرائے کو "بہترین انگلش جنٹلمین" اور "بہترین عیسائی جنٹلمین" جیسے خطابات سے نواز کر اس کی چاپلوسی کر رہے تھے۔
> (ص ۳۵۲)

اس سے بہت پہلے مشہور جریدہ اسٹیٹسمین نے اپنی ۱۲ر جولائی ۱۹۴۰ء کی اشاعت کے مقالہ افتتاحیہ میں لکھا تھا کہ

> یہی ایک لیڈر ہے جس نے ہمیشہ صداقتوں کو بے نقاب کیا ہے۔

———(۰)———

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ قائدِاعظمؒ ایک ڈکٹیٹر تھے۔ ایسا کچھ وہی لوگ کہہ سکتے ہیں جنہوں نے قائدِاعظمؒ کی سیرت کا بنظرِ تعمق مطالعہ کیا ہے نہ انہیں قریب سے دیکھنے کا موقع نصیب ہوا ہے۔ جنہیں یہ سعادت نصیب ہوئی ہے، وہ جانتے ہیں کہ حقیقت اس کے کس قدر خلاف تھی۔ ایک واقعہ سنیئے جسے ان کے پرائیویٹ سیکرٹری (سیّد مطلوب حسن صاحب) نے بیان کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے:-

ایک مرتبہ ہندوستانی فوج کے ایک کپتان نے ایک محفل میں قائدِ اعظمؒ سے پوچھا کہ کیا پاکستان اقتصادی طور پر اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل ہوگا؟ قائدِ اعظمؒ نے یہی سوال اُس کپتان پر دُہرایا۔ اُس نے کہا کہ بے شک یہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے گا۔ اس پر قائدِ اعظمؒ نے پوچھا کہ تم کس بناء پر ایسا کہتے ہو؟ اس نے کہا کہ اس بناء پر کہ ہمارا قائد ایسا کہتا ہے۔ قائدِ اعظمؒ نے اس کی طرف غصّہ بھری آنکھوں سے دیکھا اور کہا کہ آزاد پاکستان میں تم وہ پہلے افسر ہو گے جسے نوکری سے برطرف کر دیا جائے گا۔

(نوائے وقت - ۴ جنوری ۱۹۷۷ء)

بات واضح تھی کہ جو شخص اپنی کوئی رائے نہیں رکھتا۔ اور ایک بات کو صرف اس لئے مان لیتا ہے کہ اُس کے لیڈر نے ایسا کہہ دیا ہے، قائدِ اعظمؒ کے نزدیک وہ اس قابل ہی نہیں تھا کہ آزاد پاکستان میں کوئی عظیم ذمہ داری اُس کے سپرد کی جائے۔

یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ اپنے تمام رفقاء کے مقابلے میں قائدِ اعظمؒ کا مقام کس قدر بلند تھا لیکن اس کے باوجود اُن کے دل میں مخلص کارکنوں کا کس قدر احترام تھا، اُس کے متعلق اصفہانی صاحب کی زبان سے سنیئے۔ وہ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:-

رفقاء کا احترام

یہ اُس شام کا واقعہ ہے جب ۱۹۴۳ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس دہلی میں منعقد ہونے والا تھا۔ میں نے اور راجہ صاحب محمود آباد نے مسٹر جناحؒ اور مس فاطمہ جناحؒ کے ساتھ کھانا کھایا۔ ہم نے قائدِ اعظمؒ سے اجازت چاہی تاکہ ہم ان کے سیشن میں پہنچنے سے پہلے مجلسِ عاملہ کے ارکان کی حیثیت سے اپنی نشستیں سنبھال لیں۔ بجائے اس کے کہ وہ ہمیں خدا حافظ کہتے، انہوں نے کہا کہ ذرا ٹھہر جایئے۔ ہم اکٹھے سیشن میں جائیں گے۔ ہمارے لئے یہ فرمان بڑا تعجب انگیز تھا۔ لیکن ہمیں سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ ہم چاروں ایک ہی گاڑی میں پنڈال میں پہنچے، اور میں اور راجہ صاحب دروازے پر ٹھہر گئے تاکہ قائدِ اعظمؒ اور ان کی ہمشیرہ آگے تشریف لے جائیں اور ہم پنڈال میں اُن کے بعد پہنچیں۔ ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب قائدِ اعظمؒ آگے نہ بڑھے اور ہم سے کہا کہ ہم چاروں ہمدوش ایک ہی لائن میں پنڈال میں داخل ہوں گے۔ ہم لاکھوں کے مجمع میں اس طرح چند ہی قدم آگے بڑھے تھے کہ انہوں نے انتہائی مسرّت کے لہجے میں کہا۔ "میرے عزیزو! کیا تم اس منظر کو دیکھ کر فرطِ مسرّت سے جھوم نہیں اُٹھے؟ اس لاکھوں کے مجمع کو دیکھو اور پھر سوچو کہ ہم نے تھوڑے سے وقت میں اتنی لمبی مسافت طے کر لی ہے۔ میں آج آپ کو ساتھ لے کر اس لئے پنڈال میں داخل ہوا ہوں کہ میں اُس احترام کا اظہار کر سکوں جو آپ کا میرے دل میں ہے اور ان لاکھوں ناظرین کو دکھا سکوں کہ میں پُرخلوص خدمات کی اتنی قدر کرتا ہوں۔ (صفحات ۱۰۸-۱۰۷)

سوچیئے کہ کیا ڈکٹیٹروں کی یہی ذہنیت ہوتی ہے؟

امیرالمؤمنین

مسٹر اصفہانی نے دوسری جگہ لکھا ہے کہ

ایک دفعہ اُن کے بعض مداحوں نے جوشِ عقیدت میں انہیں امیرالمؤمنین کہہ کر پکارا۔ انہوں نے فوراً روک دیا اور کہا کہ میں امیرالمومنین نہیں ہوں۔ میری تعریف میں حد سے مت بڑھو۔ (ص ۱۷۱)

علی گڑھ یونیورسٹی کے ساتھ قائدِاعظمؒ کو جس قدر گہرا تعلق تھا اور وہاں کے طلبا کے دل میں ان کا احترام جس قدر تھا اس کی بابت کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ ۱۹۴۲ء کا ذکر ہے کہ ان کے پاس اس احترام اور عظمت کے پیشِ نظر اس یونیورسٹی نے ڈاکٹر آف لا کی ڈگری کی پیشکش کی لیکن قائدِاعظمؒ نے اسے یہ کہہ کر قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ میں مسٹر جناحؒ ہی اچھا ہوں، آپ کا شکریہ!

(قائدِاعظمؒ کی خط وکتابت مرتبہ سید شریف الدین پیرزادہ۔ ص ۴۰۹)

(۰)

عام تاثر یہ ہے کہ قائدِاعظمؒ حارد یالس قسم کے قانون دان اور ان منطقی مزاج انسانوں میں سے تھے جن میں حسِ لطیف کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ یہ صحیح نہیں۔ ان کی شخصیت علامہ اقبالؒ کے اس مثالی کردار کی زندہ پیکر تھی، جس کے متعلق انہوں نے کہا ہے کہ ؎

تنے پیدا کن از مشتِ غبارے ۔۔۔ تنے محکم تر از سنگیں حصارے
درونِ او دلِ درد آشنائے ۔۔۔ چو جوئے در کنارِ کوہسارے!

حسِ لطیف

ان کے آہنی پیکر میں قلبِ سلیم بریشم کی طرح نرم اور پھول کی طرح شگفتہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ جو انسان جذباتِ لطیف سے عاری ہو وہ انسان نہیں، حیوانی سطح پر ہوتا ہے۔ حسِ مزاح اسی ذوقِ لطیف کی مظہر ہوتی ہے اور قائدِاعظمؒ کو اس کا بہرۂ وافر عطا ہوا تھا، اس خصوصیت کے ساتھ کہ وہ مزاح اور استہزاء میں فرق کرنا جانتے تھے۔ اُن کا نشتر ٹھیک ٹھکانے پر لگتا جس سے ان کے ہدف کی کیفیت ـــــ یہ ہو جاتی کہ ـــــ جگر میں ٹیس لب ہنسنے پہ مجبور ـــــ اور جب اُن کا ہدف گاندھی جیسا مکار حریف ہوتا تو اس طنز کی شوخی رنگین تر ہو جاتی۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ہندوستان کے تمام نیشنل اخبارات نے ایک واقعہ کو شہ سرخیوں کے ساتھ اچھالا۔ کہا یہ گیا کہ کل شام مہاتما جی شیوگاؤں میں اپنی کٹیا میں تنہا پرارتھنا میں محو تھے کہ باہر سے ایک بڑا سا سانپ اندر گھس آیا۔ مہاتما جی کو اس پر ذرا سا بھی تردد نہ ہوا۔ وہ بدستور پرارتھنا میں محو رہے۔ سانپ نے مہاتما جی کے گرد چکر لگایا اور جس طرح خاموشی سے آیا تھا اسی طرح خاموشی سے باہر نکل گیا۔ اخبارات نے اسے مہاتما جی کی بہت بڑی کرامت قرار دیا اور ملک بھر میں اس واقعہ کی دھوم مچ گئی۔ کچھ صحافی قائدِاعظمؒ کے پاس آئے۔

اور ان سے پوچھا کہ آپ نے اخبارات میں یہ خبر پڑھی ہے؟ آپ نے کہا کہ ہاں پڑھی ہے۔ انہوں نے پوچھا کہ کیا آپ کے نزدیک یہ واقع صحیح ہو سکتا ہے یا محض پراپیگنڈہ ہے؟ آپ نے کہا کہ یہ صحیح ہو سکتا ہے۔ پوچھا کہ پھر سانپ کے اس طرزِ عمل کی آپ کے نزدیک توجیہہ کیا ہے؟ فرمایا (PROFESSIONAL ETIQUETTE) یہ جواب وہ ہے جس کا لطف تو لیا جا سکتا ہے، تشریح نہیں کی جا سکتی۔ تشریح کرنا ایسا ہی ہوگا جیسے خوشبو کی تلاش میں پھول کی پتی کو مسل کر رکھ دیا جائے۔ یہ دو لفظ ملک کی ساری فضا میں پھیل گئے۔ "مہاتما گاندھی" پر اس سے کیا گزری ہوگی، اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

یہ تھی اس مردِ آہن کی حسِّ لطیف اور ذوقِ شگفتگی۔

(۰)

اب ہم زندگی کی اس شاہراہ کی طرف آتے ہیں جو تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک ہے۔ اس میں وہ گھاٹیاں آتی ہیں جن پر بڑے بڑوں کے پاؤں پھسل جاتے تھے لیکن قائدِ اعظمؒ اس دشوار گزار اور پُرخطر راستے سے بھی پاکیزہ پاکیزہ گزر گئے۔ اس راستے کا تعلق جنسیات سے ہے۔

قائدِ اعظمؒ کی پہلی شادی، ان کے والدین نے ان کے بچپن کے زمانے میں کر دی تھی اور وہ بیوی بھی جلد ہی فوت ہو گئی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے بہ سال کی عمر تک شادی نہیں کی اور ان کا یہ تمام عہدِ شباب، سپیدۂ سحر کی طرح بے داغ گزرا، درآنحالیکہ دولت، شہرت، قابلیت کے لحاظ سے بھی ان کا شمار ممتاز ترین شخصیتوں میں ہوتا تھا اور اس کے علاوہ مردانہ حسن و رعنائی میں بھی ان کا جواب نہیں تھا۔ بمبئی میں پارسیوں کا ایک ممتاز ترین اور متمول ترین خاندان تھا جس کے سربراہ "سر ڈنشا پٹیٹ" کی اکلوتی لڑکی رتن بائی، حسنِ سیرت و صورت میں بے مثال تھی۔ یہ دونوں شادی پر رضامند ہو گئے۔ ظاہر ہے کہ سر ڈنشا، ایک مسلمان کے ساتھ اپنی لڑکی کی شادی پر کس طرح رضامند ہو سکتے تھے؟ لیکن بیٹی کے اصرار پر انہیں بالآخر رضامند ہونا پڑا۔ معاملہ یوں طے پا گیا تو "مسٹر جناح" نے یہ شرط عائد کر دی کہ لڑکی کو پہلے اسلام قبول کرنا ہوگا، تب شادی ہو سکے گی۔ اس پر سر ڈنشا کے خاندان میں کہرام مچ گیا اور صاف نظر آتا تھا کہ اس شرط پر اصرار سے یہ رشتہ استوار نہیں ہو سکے گا۔ آج کل کی اصطلاح میں اسے "لو میرج" سے تعبیر کیا جائے گا۔ یہ شادی (سول میرج) کے طریق سے بھی انجام پا سکتی تھی لیکن مسٹر جناحؒ اپنی شرط پر قائم رہے اور شادی نہیں کی جب تک مس رتن بائی نے اسلام قبول نہیں کر لیا، یہ اُس زمانے کی بات ہے جب مسٹر جناحؒ قائدِ اعظم نہیں بنے تھے۔ فقط مسٹر جناحؒ تھے۔

یہی وہ شادی تھی جس کے خلاف ہمارے ہاں کے "حکومتِ الٰہیہ" کے قیام کے مدعیوں نے یہ افتراء پھیلایا تھا کہ ؎

اِک کافرہ کے واسطے اسلام کو چھوڑا یہ قائدِ اعظمؒ ہے کہ کافرِ اعظم

اس رفیقۂ حیات کے انتخاب کے سلسلے میں اور بھی کئی عناصر کارفرما ہو سکتے ہیں لیکن ہمارے نزدیک اس کی بنیادی وجہ حق گوئی اور بیباکی کی وہ خصوصیت تھی جو خود قائدِ اعظمؒ کے کردار کا بنیادی حصّہ تھی۔ اس کی شہادت ہمیں اس واقعہ سے ملتی ہے۔

۱۹۲۱ء کا ذکر ہے کہ مسٹر اور مسز جناحؒ اس زمانے کے وائسرائے (لارڈ ریڈنگ) کے ساتھ لنچ تناول فرما رہے تھے۔ دورانِ گفتگو وائسرائے نے مسز جناح سے کہا کہ وہ جرمنی جانا چاہتے ہیں لیکن ۔ ایسا کر نہیں سکتے۔ مسز جناح نے کہا کہ کیوں؟ وائسرائے نے جواب دیا کہ اس لئے کہ وہاں کے لوگ مجھے پسند نہیں کرتے۔ اس پر مسز جناح نے کھٹ سے کہا کہ "پھر آپ یہاں کیسے تشریف لے آئے ہیں"؟ (ڈان کراچی ۲۸/۱۱/۷۶)
غور فرمایئے کہ کیا یہ خود مسٹر جناح کی صدائے بازگشت نہیں؟

سحرِ فرنگ

مسز جناح ۱۹۲۹ء میں وفات پاگئیں اور اس کے بعد قائدِ اعظمؒ نے بقیہ ساری زندگی تجرّد میں گزار دی۔ اس دوران میں انہیں کس کس قسم کی آزمائشوں میں سے گزرنا پڑا، اس کی ایک مثال حال ہی میں ہمارے سامنے آئی ہے۔ تقسیمِ ہند کی گتھی سلجھانے کے لئے سب سے آخر لارڈ ماؤنٹ بیٹن آیا تھا اور اس کے ساتھ اس کی بیوی ایڈوینا بھی تھی۔ نظر بظاہر یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ یورپین ممالک کی بیویاں زندگی کے ہر شعبہ میں خاوندوں کے ساتھ رہتی ہیں اس لئے اس وقت اس طرف کسی کا خیال تک بھی نہیں جا سکتا تھا کہ یہ "محترمہ" کوئی خاص مشن لے کر آئی ہیں۔ عمر کے اعتبار سے وہ پینتالیس سال کی تھی لیکن اس کے حسن و جمال، اس کی رعنائیوں اور زیبائیوں، اس کی عشوہ بازیوں اور سحر طرازیوں کے چرچے عام تھے اور یہی تھے وہ ریشمیں جال جنہیں اپنے ساتھ لے کر وہ انڈیا آئی تھی۔ اس کا کسی کو پتہ ہی نہ چلتا اگر رچرڈ ہوگ کی مرتب کردہ، "لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی سوانح عمری شائع نہ ہوتی۔ اس میں اس جادوگرنی کے حیرت انگیز کرتب سامنے آئے ہیں۔ اس میں لکھا ہے:۔

اس زمانے میں جب ہندوستانی عورتوں کا سیاست میں کچھ نمایاں عمل دخل نہیں ہوتا تھا مسئلہ تقسیمِ ہند کی گفت و شنید کے لئے جو (انگریز) اربابِ حل و عقد یہاں آئے تھے ان کی بیویوں نے اس باب میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا اس میں سرِ فہرست ایڈوینا تھی۔ اس کی سحر طرازیوں کا اوّلین ہدف جواہر لال نہرو تھا۔ وہ مجرّد تھا اور ایک عورت کی رفاقت سے محرومی کو شدت سے محسوس کرتا تھا۔ (ایڈوینا نے اس راز کو بہت جلد پا لیا) یوں تو اس ساحرہ نے ہندوستان کے سب لیڈروں کو مسحور کیا لیکن نہرو کے ساتھ اس کے تعلقات بڑے گہرے ہو گئے۔ ان تعلقات نے انتقالِ اقتدار کے مسئلہ پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔ ماؤنٹ بیٹن کو تو سب کچھ معلوم تھا لیکن اس کا اس نے قطعاً بُرا نہ منایا۔ اس کے برعکس وہ اس پر فخر کرتا تھا اور اپنی بیوی کو اس کی داد دیتا تھا اور اس سے کہتا تھا کہ تم نے کمال کر دکھایا! اسے بھی پیشِ نظر رکھیئے کہ ایڈوینا کی رگوں میں یہودی خون بھی تھا۔

حتیٰ کہ گاندھی بھی اس ساحرہ کے جادو سے متاثر ہو گیا اور بہت جلد اسے "میری پیاری دوست" کہنے لگ گیا۔ اگرچہ ایڈوینا کے ساتھ اس کے تعلقات کی نوعیت، نہرو کے ساتھ اس کے تعلقات سے مختلف تھی۔ ماؤنٹ بیٹن نے اس سے بھی فائدہ اٹھایا اور ایک ہی نشست میں گاندھی کو رام کر لیا۔

آپ اس جادوگرنی کے "حصار" سے باہر نکل آئیے اور فخر و مباہات سے (HOUGH) کے اس اعتراف کو پڑھیئے کہ "اس سارے ہجوم میں اگر کسی پر اس ساحرہ کے جادو کا کوئی اثر نہ ہوا ہو تو وہ قائدِ اعظمؒ محمد علی جناحؒ تھا۔" اس کے بعد مصنف لکھتا ہے کہ لارڈ ویول نے (جو کسی زمانے میں وزیرِ ہند رہ چکا تھا) کہا ہے کہ ماؤنٹ بیٹن جناحؒ کے متعلق صحیح اندازہ لگا ہی نہیں سکا۔ یہ اس کی بڑی غلطی تھی۔ اصل یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی اس کا اندازہ نہیں لگا رہا تھا کہ ماؤنٹ بیٹن نے نہرو اور گاندھی کے ساتھ جس قسم کے تعلقات وابستہ کر لئے تھے۔ جناحؒ اسے کس قدر ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ (ہمیں ان امور کا صحیح صحیح اندازہ کرنا چاہیئے تھا کیونکہ) جناحؒ وہ واحد شخص تھا جس کے ہاتھ میں ہندوستان کے مستقبل کی کلید تھی۔ ماؤنٹ بیٹن نے کہا تھا کہ اس نے جناح کے ساتھ بھی وہی حربے استعمال کرنے چاہے جن سے اس نے گاندھی اور نہرو کو رام کر لیا تھا، لیکن وہ اس میں یکسر ناکام رہا۔ جناحؒ میں قطعاً لچک نہیں تھی۔ اس کا ایک ہی خواب تھا اور وہ تھا ایک جداگانہ مسلم سٹیٹ کا قیام۔ تقسیم سے متعلق گفتگو کی مجالس میں وہ آتا تو ایک لفظ کہے بغیر، محض اس کی آمد سے تمام شرکائے محفل پر سکتہ طاری ہو جاتا ــــ اپنے اصولوں کا پکا۔ قطعاً نہ جھکنے والا۔ اس سے بات کرنا آسان کام نہ تھا (بالآخر ہمیں اس کے سامنے جھکنا پڑا)۔

(۰)

آخر میں چند الفاظ اس اعتراض کی تردید میں کہ پاکستان سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے مفاد کے تحفظ کے لئے حاصل کیا گیا تھا۔ "قائدِ اعظمؒ اور معاشی مسئلہ" ایک مستقل موضوع ہے جس کے متعلق بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ لیکن میں اس مقام پر اس کی صرف دو ایک مثالیں پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔

۱۹۴۳-۴۴ء میں جنگِ پاکستان اپنی انتہائی شدت پر پہنچ چکی تھی۔ مصلحت کا تقاضا تھا کہ اس وقت بڑے بڑے متمول شرکاء کو اپنے ساتھ رکھا جائے۔ ۱۹۴۳ء میں دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کا خاص اجلاس منعقد ہوا۔ اس کے صدارتی خطاب کے دوران قائدِ اعظمؒ نے فرمایا:-

سرمایہ دار اور جاگیردار

اس مقام پر میں زمینداروں اور سرمایہ داروں کو بھی متنبہ کرنا چاہتا ہوں وہ ایک ایسے فتنہ انگیز ابلیسی نظام کی رُو سے جو انسان کو ایسا بدمست کر دیتا ہے کہ وہ کسی معقول بات کے سننے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا۔ یہ لوگ عوام کے گاڑھے پسینے کی کمائی پر رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ عوام کی محنت کو غصب کر لینے کا جذبہ ان کے رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے۔ میں اکثر دیہات میں گیا ہوں۔ میں نے دیکھا ہے کہ لاکھوں خدا کے بندے ہیں جنہیں ایک وقت بھی پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی۔ کیا اس کا نام تہذیب ہے؟ کیا یہی پاکستان کا مقصود ہے؟ اگر پاکستان سے یہی مقصود ہے تو میں ایسے پاکستان سے باز آیا۔ اگر ان سرمایہ داروں کے دماغ میں ہوش کی ذرا سی بھی رمق باقی ہے

تو انہیں زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ چلنا ہوگا۔ اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو ان کا
خدا حافظ۔ ہم ان کی کوئی مدد نہیں کر سکیں گے۔
انہوں نے یکم مارچ ۱۹۴۵ء کو مسلم لیگ ورکرز سے کلکتہ میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا:۔
میں ایک بوڑھا آدمی ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے مجھے اتنا دے رکھا ہے کہ میں اپنے
اس بڑھاپے کی زندگی کو نہایت آرام اور سہولت سے گزار سکتا ہوں۔ مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ
میں دن رات بھاگے بھاگے پھروں اور اپنا خون پسینہ ایک کر دوں۔ میں یہ تگ و تاز سرمایہ داروں
کے لئے نہیں کر رہا۔ میں یہ محنتِ شاقہ آپ غریبوں کے لئے کر رہا ہوں۔ میں نے ملک میں درد انگیز
مفلسی کے مناظر دیکھے ہیں۔ ہم کوشش کریں گے کہ پاکستان میں ہر فرد خوشحالی کی زندگی بسر
کر سکے۔

(۰)

آخر میں، میں اسے ایک نہایت حسین اور دلآویز مقطع پر ختم کرنا چاہتا ہوں۔ میرے نزدیک کسی شخص کے
کردار میں کندن کی سی صلابت اور ہیرے کی سی درخشندگی پیدا نہیں ہو سکتی جب تک اس نے (شعوری یا غیر شعوری
طور پر) سیرتِ محمدیہ کی شمعِ نورانی سے کسبِ ضیا نہ کیا ہو۔ قائداعظمؒ کی سیرت کی تابندگی بھی اُس کی رہینِ منت
تھی۔ حضورؐ کی ذاتِ اقدس و اعظم کے ساتھ اُن کی شیفتگی کا کیا عالم تھا۔ اس کی مثال ہمیں اس زمانے میں ملتی
ہے جب ان کی عمر ہنوز سولہ سال کی تھی۔ وہ بیرسٹری کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے انگلستان گئے تو سوال یہ سامنے
آیا کہ وہ کس درس گاہ میں داخلہ لیں۔ انہوں نے ۱۹۴۷ء میں کراچی بار ایسوسی ایشن کو خطاب کرتے ہوئے کہا:۔
میں نے بالآخر "لنکنز اِن" میں داخل ہونے کا فیصلہ کیا۔ یہ اس لئے کہ اس کے بڑے دروازے پر
دنیا کے ممتاز ترین مقننین کی جو فہرست کندہ تھی اس میں نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا اسمِ گرامی
بھی شامل تھا۔

(ہیکٹر بولیتھو)

حضورؐ کی ذاتِ اقدس سے عقیدت

۱۳ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کی پہلی مجلسِ دستور ساز سے خطاب کرتے ہوئے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے
ناصحانہ انداز میں کہا کہ مجھے امید ہے کہ پاکستان میں غیر مسلم اقلیتوں سے اسی قسم کی رواداری اور حسنِ سلوک کا ثبوت
دیا جائے گا جیسا شہنشاہ اکبر نے روا رکھا تھا۔ یہ سن کر قائداعظمؒ نے جھٹ سے جواب دیا کہ
غیر مسلموں کے ساتھ حسنِ سلوک کے لئے ہمیں کسی اکبر کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں، ہمارے سامنے
ہمارے رسولِ اکرمؐ کا اسوۂ حسنہ ہے، جنہوں نے عیسائی اور یہودی اقلیتوں سے ایسی کشادہ ظرفی
کا برتاؤ کیا جس کی مثال تاریخِ عالم میں نہیں ملے گی۔ ہم اس رسولؐ کے اسوۂ حسنہ کا اتباع کریں گے۔
کراچی بار ایسوسی ایشن کے زیرِ اہتمام ۲۵ جنوری ۱۹۴۸ء کی جشنِ میلاد النبیؐ کی تقریب

میں قائدِ اعظمؒ نے فرمایا تھا کہ

آج ہم یہاں دنیا کی عظیم ترین ہستی کو نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ حضورؐ کی عزت و تکریم کروڑوں مسلمان ہی نہیں کرتے بلکہ دنیا کی تمام عظیم شخصیتیں آپ کی بارگاہ میں سر جھکاتی ہیں۔ میں ایک عاجز ترین۔ انتہائی خاکسار بندۂ ناچیز ایسی عظیم، بلکہ عظیموں کی بھی عظیم ترین ہستی کو بھلا کیا، اور کیسے نذرانۂ عقیدت پیش کر سکتا ہوں۔ رسولِ اکرمؐ عظیم مصلح تھے۔ عظیم ترین رہنما تھے۔ عظیم واضعِ قوانین تھے۔ عظیم سیاستدان تھے۔ عظیم حکمران تھے (صلے اللہ علیہ وسلم)۔

(۰)

یہ ہیں قائدِ اعظمؒ کی اُس عظمتِ کردار اور رعنائی سیرت کی چند جھلکیاں، جن کے بل بوتے پر انہوں نے بے تیغ و سناں، چومکھی لڑائی لڑ کر ایک عظیم مملکت حاصل کر لی۔ تاریخِ عالم کا یہ، یقیناً ایک منفرد واقعہ ہے۔ طاب لہٗ وحسن مآب۔

شادابیوں اور کامرانیوں کی اس قسم کی پُر مسرت داستان کے بعد، میں آپ کی آنکھوں کو غم کے آنسوؤں سے نم آلود نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن ؎

دل کا خوں آنکھ میں کھنچ آئے تو کیا اس کا علاج؟
نالہ رو کا تھا کہ یہ پردہ در راز نہ ہو

مجھے جب بھی، حالاتِ مابعد کے تناظر میں اُن حسین خوابوں کی یاد آتی ہے، تو دل سے ایک ہوک اٹھتی ہے اور بے ساختہ زبان پر آجاتا ہے کہ ؎

ویراں ہے میکدۂ خمّ و ساغر اُداس ہیں!
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے!

پرویز

(۰)

کراچی میں
ادارہ طلوعِ اسلام کی کتابیں
مندرجہ ذیل دوکان سے بھی دستیاب ہو سکتی ہیں:۔
علمی کتاب گھر
اُردو بازار کراچی فون نمبر: ۲۱۸۷۱۳